ماہنامہ

ترجمان القرآن

نومبر ۱۹۹۳ء

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

*** سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیم القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: -/۱۷۵ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۶۶۶۵ - ۲۳۴۰۱۴ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۹
نومبر ۱۹۹۳

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۵۳۲۰

ماہنامہ
ترجمان القرآن
لاہور

جلد ۱۱۹ عدد ۱۱

نومبر ۱۹۹۳ جمادی الاول ۱۴۱۴

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰، فون نمبر ۷۵۷۰۱۴۴-۸، فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۳۷۱۹
برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰، فون نمبر ۷۲۳۳۴۰۴ - ۷۲۳۶۲۲۵
پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۳۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ مینیجر ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۶ روپے ○ زر سالانہ: ۶۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۲۰ ڈالر یورپ: ۲۵ ڈالر امریکہ و آسٹریلیا: ۲۵ ڈالر

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

پانچ سال میں تیسری دفعہ ملک پر مسلط کردہ انتخاباتِ بھی ایک بار پھر' چہروں کی تبدیلی کے علاوہ' کوئی نتیجہ نکالے بغیر اپنے اختتام کو پہنچ گئے۔ نہ پے در پے پیدا ہونے والے بحرانوں کے اسباب کا کچھ ازالہ ہوا' نہ ملک کو درپیش سنگین خطرات اور مسائل کے حل کی کوئی راہ نکلی' نہ سیاسی استحکام کا سامان ہوا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ' نہ ملک کے غریب اور مظلوم عوام کا مقدر جاگنے کی کوئی سبیل پیدا ہوئی۔

اب بھی یہ عوام اسی طرح ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے' اور ان کو دین و ایمان اور اخلاق کی دولت سے محروم رکھا جاتا رہے گا۔ چوپالوں' تھانوں' دفتروں اور کارخانوں میں انہیں اسی طرح ذلیل کیا جاتا رہے گا' ان کی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں اسی طرح "بڑوں" کی جاگیر بنی رہیں گی اور انہیں بازاروں اور تھانوں میں اسی طرح ننگا کیا جاتا رہے گا۔ اب بھی ان کو دو وقت اپنا پیٹ بھرنا اسی طرح دوبھر رہے گا' اور گرانی کا روز بروز بڑھتا بوجھ ان کی کمر توڑتا رہے گا۔ ان کے بچے اب بھی اسی طرح تعلیم سے محروم رہیں گے' اور جو تعلیم پالیں گے وہ کاغذ کے ٹکڑے ہاتھوں میں لیے روزگار کے لیے اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ دفتروں اور عدالتوں میں ان کے فیصلے اب بھی غیر ملکی آقاؤں کی اسی زبان میں ہوتے رہیں گے جسے سمجھنے سے وہ قاصر ہیں۔ انصاف اب بھی ان کی دسترس سے باہر رہے گا' اور قانون اب بھی ظالم کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ کسان اب بھی اسی طرح اپنی محنت کے صلہ سے محروم رہیں گے' ان کے دیہاتوں میں اسی طرح اندھیرا رہے گا' انہیں پینے کے لیے خالص پانی اب بھی نہیں ملے گا' ان کے مریض اسی طرح دواؤں کے لیے ترستے رہیں گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے رہیں گے' ان کی بیل گاڑیاں اور ٹریکٹر اسی طرح ٹوٹی پھوٹی مٹی کی سڑکوں پر دھول کھاتے چلتے رہیں گے

جبکہ دوسری طرف اسلام آباد - لاہور موٹروے جیسی صاف شفاف اور چمکتی دمکتی سڑکیں بنتی رہیں گی' ان کے بچے اب بھی انہی بے چھت کے پرائمری سکولوں میں پڑھتے رہیں گے جہاں نہ فرنیچر ہوتا ہے نہ استاد۔

ادھر قومی کشتی کے ناخدا اب بھی پہلے کی طرح کشکول گدائی بھر بھر کے آنے والی نسلوں کا بال بال قرضوں کے جال میں جکڑتے رہیں گے' یہاں تک کہ آج حکومت کی ۳۶ فیصد آمدنی قرضوں کی ادائیگی میں جاتی ہے تو کل نوبت یہاں تک پہنچا دی جائے گی کہ ۱۰۰ فیصد دے کر بھی جان نہ چھوٹے گی۔ انہی قرضوں کی خاطر' سامانِ تعیش اور اسلحہ کے حصول کی خاطر' ملکی مفادات کے سودے کیے جاتے رہیں گے' اور انتہائی حساس عہدوں پر فائز افراد کو کان پکڑ کے اٹھایا اور بٹھایا جاتا رہے گا' کشمیر کے مجاہد بھائیوں کی مدد سے ہاتھ کھینچا جاتا رہے گا' اسلام دشمن استعمار کے مفادات کی تکمیل کی خاطر خون بہانے کے لیے وہ پاکستانی فوجی "صومالیہ" اور "سعودی عرب" بھیجے جاتے رہیں گے' جن کے اوپر پاکستان کے عوام قرضوں کی ادائیگی کے بعد' اپنی بچی کھچی تقریباً ساری آمدنی نچھاور کر دیتے ہیں۔

بینظیر وزیراعظم بن گئی ہیں تو بھی یہ سب کچھ ہوتا رہے گا' نواز شریف بن جاتے تو بھی یہی سب کچھ ہوتا رہتا۔ شاید کچھ فی صد کم ہوتا کہ ہمیں اپنے دوستوں کے اس اصرار سے انکار نہیں کہ وہ برائی تو ہیں لیکن ایک چھوٹی برائی ہیں۔

یہ سب کچھ اب بھی پہلے کی طرح اس لیے ہوتا رہے گا کہ رائے دہندگان نے ایک بار پھر اپنی گردنوں پر انہی تین چار سو سرمایہ دار' جاگیردار' بیوروکریٹ خاندانوں کے افراد کے پیر تسمہ پا کو بٹھا لیا ہے جو آج تک ان کے مقدر کو تاریک سے تاریک تر کرتے چلے آ رہے ہیں' اور ملک کی بھلائی و بہتری کو اپنے مفاد کی خاطر داؤ پر لگاتے رہے ہیں۔ ہم عوام کو ان کے اس فعل کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہراتے۔ بے شمار تاریخی' سماجی اور نفسیاتی عوامل نے ان کو ایک ایسے روز افزوں شر کے چکر (vicious circle) میں پھنسا دیا ہے جس سے نکلنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔ فساد اور ظلم سے نجات ان کے اپنے مضبوط فیصلہ اور جرات مندانہ اقدام کے بغیر ممکن نہیں۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا' جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ (الرعد ۱۳ : ۱۱)۔ لیکن اس قوتِ فیصلہ اور جراتِ اقدام کو ہی فساد اور ظلم نے ماؤف کر رکھا ہے۔

اب یہ چکر کیسے ٹوٹے' کہاں سے ٹوٹے' کون توڑے ؟

دوسری طرف وہ جو ظلم اور فساد کی حقیقت سے واقف ہیں' جو اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے درکار قوتِ ارادہ اور جراتِ اقدام کو پیدا کرسکتے ہیں' جگا سکتے ہیں' ان میں سے بہت سوں نے سہل انگاری کی خاطر اھون البلیتین کے بہانہ سونے کے بچھڑے گھڑ لیے ہیں' اور انہی سے اپنی امیدیں اور وابستگیاں قائم کرلی ہیں۔ اور خود اپنے درمیان ان کا فسوں پھونکنے میں مشغول ہوگئے ہیں۔ گو سالہ سونے کا ہو تو پرستاروں کی کیا کمی ہو سکتی ہے!

ان انتخابات میں جماعتِ اسلامی نے پاکستان اسلامی فرنٹ کے ذریعہ حصہ لیا تھا۔ لیکن فرنٹ کو بنے تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے' فرنٹ کے نام کے پیچھے دراصل جماعتِ اسلامی ہی کی تنظیم اور قوت تھی' اسی کا ۵۲ سالہ کام اور پیدا کردہ اثرونفوذ تھا۔ اگر جماعت اپنے نام سے حصہ لیتی تو بھی نتائج کچھ مختلف نہ ہوتے۔ اس لحاظ سے' جو کچھ ہوا' یہی وہ پہلو ہے جس کا قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ ہم اس موقعہ پر لینا چاہتے ہیں۔

پاکستان اسلامک فرنٹ جیسی کسی تنظیم کی ضرورت اور اس خیال اور سوچ کے بارہ میں ہم فروری ۱۹۹۳ کے شمارہ میں اپنا استدلال پیش کرچکے ہیں۔ اس فرنٹ کے قیام کے بعد' جولائی ۱۹۹۳ کے شمارہ میں ہم نے اس فرنٹ کی نوعیت کی تشریح بھی کی تھی' اور اس سلسلہ میں اٹھنے والے سوالات اور شبہات کا جواب دینے کی کوشش بھی۔ پھر ستمبر ۱۹۹۳ میں' فرنٹ کی انتخابی پالیسی کی توضیح --- یعنی کسی سے اتحاد کے بغیر' فرنٹ کا اپنے تشخص کے بل پر ایک متبادل قوت کے طور پر' تعارف و تشکیل --- اور اس ضمن میں محض پیپلزپارٹی کو ہرانے کی غرض سے' ایک چھوٹی برائی کے طور پر' جناب نواز شریف کے پیچھے نہ لگنے کی پالیسی کے خلاف سوالات اور اعتراضات سے بحث کی گئی تھی۔

ان انتخابات میں اسلامک فرنٹ نے قومی اسمبلی میں کراچی سے ایک' اور سرحد سے ۲ سیٹیں حاصل کیں۔ پنجاب اور بلوچستان سے اسے کوئی سیٹ نہیں ملی' اور کراچی کی سیٹ کے بارہ میں بھی اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ایم کیو ایم بائیکاٹ نہ کرتی تو یہ بھی نہ ملتی۔ صوبائی اسمبلیوں میں اسے پنجاب سے ۲' اور سرحد سے ۴ سیٹیں ملیں۔

ان نتائج کو ہزیمت سے تعبیر کیا گیا ہے' اور صحیح کیا گیا ہے' خصوصاً ان توقعات کے پیش نظر جو انتخابات سے قبل قائم کرلی گئی تھیں۔ لیکن یہ نتائج ہماری توقعات سے کچھ بعید نہیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ

مستقل حکمتِ عملی [یعنی اسلامک فرنٹ ایک علیحدہ قوت کے طور پر انتخابات میں حصہ لے] پیش رفت کے لیے وقت چاہتی ہے' اور انتخابات سر پر کھڑے ہیں۔ ... (ستمبر ۱۹۹۳' ص ۵)

موجودہ حالات میں' جب دو بڑی متحارب قوتیں میدان میں نبرد آزما ہیں' ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمارے رائج طریقِ انتخاب کے تحت یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو۔ (ایضاً' ص ۱۲)

جب معرکہ گرم ہو تو اس سے زیادہ حقیقت گوئی اور حساب کتاب کی گنجائش نہیں ہوتی' اس لیے کہ انتھک محنتوں کے چراغ امیدوں کے تیل سے جلتے ہیں۔

اجتماعی گروہوں کے لیے' تنظیمیں ہوں یا قومیں' اپنی مساعی اور اعمال کے نتائج کو مشیتِ الٰہی کا نتیجہ قرار دے کر بیٹھ جانا صحیح نہیں۔ یقیناً مشیتِ الٰہی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا' لیکن دنیاوی نتائج میں بھی یہ مشیت سننِ الٰہی کے مطابق کارفرما ہوتی ہے' اس لیے اس کو اپنی ناکامی کی توجیہہ کے لیے بیساکھی بنانا مناسب نہیں۔

نہ ہم ان گروہوں کے لیے دنیا میں ناکامی کا متبادل آخرت کی کامیابی کو قرار دے کر مطمئن ہو جانے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ آخرت میں تو ہر انسان انفرادی طور پر جواب دہ ہوگا' اور وہ اپنے اعمال کے مطابق کامیاب یا ناکام ہوگا۔ دنیا میں اجتماعی کامیابی و ناکامی میں نیک و بد سب شریک ہوں گے' آخرت میں لوگ اپنی نیات و اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لشکر فتح یاب ہو' مگر ایک شہید اپنی ریاکاری یا مالِ غنیمت میں خیانت کی وجہ سے جہنم میں جائے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک لشکر ہزیمت اٹھائے' مگر اس میں شامل ہر فرد اپنے خلوص اور عمل کی وجہ سے جنت میں جائے۔ چنانچہ اجتماعی گروہوں کے لیے کامیابی یا ناکامی یہیں دنیا میں ہے۔ اس نازک مگر اہم حقیقت کو ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں۔

ہاں' ایک فرد کے لیے اپنے خلوص و محنت کی بنیاد پر مشیتِ الٰہی کے سہارے راضی بقضا رہنا' اور صرف آخرت میں فوز وجنت ہی پر نگاہ رکھنا' ایمان کا تقاضا بھی ہے' اور صبر اور امید کے دیئے جلائے رکھنے کے لیے ضروری بھی۔

ایسا ہونا بالکل ممکن ہے کہ کسی گروہ سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو' پھر بھی وہ ناکام ہو جائے' اور قوم اسے رد کر دے۔ ایسا انبیا کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن ہم جیسے ناقص انسانوں کو تو اپنی شکست کو قوم کی شکست قرار دینے' اس کا الزام قوم کی خامیوں کے سر ڈالنے' اور باطن کے بجائے خارج

میں اسباب تلاش کرنے سے پہلے خود اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہیے۔ اجتماعی گروہوں کے لیے ہر کام ' اور خصوصاً ہر معرکہ ' کے بعد اجتماعی خود احتسابی لازمی ہے۔ یہ خود احتسابی ہی پیش رفت اور فتح و غلبہ کی کلید ہے۔ یہی استغفار کا پہلا قدم ہے۔ استغفار ہی طلوعِ سحر کی نوید ہے۔ استغفار کے ساتھ ہی قوت پر قوت' اموال و تعداد میں اضافہ' آسمان سے بارشیں اور برکتوں کے نزول' اور زمین سے رزق کی بخشائش جیسے وعدے وابستہ کیے گئے ہیں۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اسی لیے ہر معرکۂ جنگ کے بعد' فتح ہو یا شکست' اور ہر اہم اجتماعی واقعہ کے بعد قرآن مجید نازل ہوتا' اور احتساب کا کام کرتا۔ اسی لیے ایسے بندوں کے بارہ میں بھی جنہیں "ربانی" قرار دیا گیا' اور ان کی مدح اعلیٰ ترین الفاظ میں کی گئی' یہ کہا گیا کہ ہر معرکہ کے بعد ان کا شعار یہ تھا کہ

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا
(آل عمران ۳ : ۱۴۷)

ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا ہو' اسے معاف کردے' ہمارے قدم جما دے۔

اور اسی لیے فتح کے آخری مرحلہ میں' جب يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر سامنے آگیا' تو حمد کے ساتھ استغفار کا حکم ہوا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو' اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو" (النصر ۱۱۰ : ۳)۔

یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جنگ یا انتخاب جیسے معرکے فتح کے لیے لڑے جاتے ہیں۔ اگر مقصود صرف دعوت و تبلیغ یا اصلاح و تعمیرِ معاشرہ ہو' تو یہ معرکے کوئی مناسب ذرائع نہیں کیونکہ ان کی روح تو حریفانہ چشمک و کشمکش ہوتی ہے' جو تبلیغ و اصلاح کے ابتدائی مراحل میں کچھ زیادہ مفید نہیں۔ کچھ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں انتخاب کے عمل میں حصہ تو ضرور لیتے رہنا چاہیے ---- خواہ ایک سیٹ بھی نہ ملے ---- کیونکہ اگر ہم نے اس کو ترک کردیا تو دین اور سیاست علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ عوام میں نفوذ بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ سیٹیں جیتنے کو انتخابات کا ہدف قرار دیتے ہیں' یہ ان پر اقتدار کے لالچ اور عجلت کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ یہ موقف ہماری دانست میں غلط سوچ پر مبنی ہے۔ نہ سیاست صرف انتخابات میں شرکت کا نام ہے'

نہ عدم شرکت سے کوئی غیر سیاسی بن جاتا ہے۔ سیاست میں بھرپور شرکت کے ہزار راستے ہیں۔ نہ سیٹوں کی صورت میں کامیابی سے بے نیاز ہو کر انتخابات میں شرکت کوئی معقول یا منطقی روش ہے۔ ہم کو فتح محبوب ہونا چاہیے' زیادہ سے زیادہ سیٹیں جیتنے کے لیے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنا چاہئیں' الاّ یہ کہ وہ خلافِ اسلام ہوں' اس مقصد کے لیے اپنی عقل استعمال کرنا چاہیے۔ ہاں' اس کے باوجود ایک سیٹ بھی نہ ملے تو کوئی پروا نہ ہونا چاہیے' کہ ہم نے اپنی عقل اور بدن پر اللہ کا حق ادا کرنے کی اپنی سی کوشش کر دی۔

چنانچہ ہماری لیے ضروری ہے کہ نتائج کے لحاظ سے ناکامی کو ناکامی سمجھیں' اسے مشیتِ الٰہی یا فوزِ آخرت کے سہارے نہ ٹال دیں اس کے اسباب و علل تلاش کریں' ان کا علاج کریں۔ اپنی غلطیوں کے تعین اور ان کے مناسب اعتراف سے ہماری قوت' ساکھ اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے' کمی نہیں۔

اسباب و علل تین طرح کے ہوتے ہیں۔ اوّل اخلاقی اسباب' یعنی وہ جن کا تعلق دین و اخلاق سے ہوتا ہے۔ دوم' تدبیری اسباب' یعنی جن کا تعلق حکمت' حکمتِ عملی اور تدابیر سے ہوتا ہے۔ سوم' مادی اسباب' جن کا تعلق مادی وسائل و ذرائع سے ہے۔ ہماری دانست میں اللہ تعالیٰ نے اجتماعی گروہوں کی کامیابی اور ناکامی اور ان کی طاقت یا ضعف کے اسباب میں اخلاقی اسباب کو فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم انھی سے بحث کریں گے۔ اس کے بعد حکمت و تدابیر کا دخل ہے۔ مادی وسائل کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن اس وقت ہم ان کو نظرانداز کریں گے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وسائل کے لحاظ سے ہمارا دو بڑی طاقتوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لاہور کی دو چار سیٹوں پر جو وسائل ان کے امیدواروں نے لگائے' وہ ہماری ملک گیر مہم کے اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں۔

---

۱ - اخلاقی اسباب میں سرفہرست اخلاص و ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے استخلاف کے وعدہ کو يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا "پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں" (النور ۲۴ : ۵۵) کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ علوو غلبہ کو ایمان پر منحصر کیا ہے۔ أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ "تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو" (آل عمران ۳ : ۱۳۹)۔ نصرتِ الٰہی کو تقویٰ اور صبر کے ساتھ وابستہ کیا ہے' جو اخلاص و ایمان ہی کے ثمرات ہیں (آل عمران ۳ : ۱۲۵)۔ ناکامی کے اسباب میں حبِ دنیا اور کثرتِ تعداد پر بھروسہ جیسی صفات کو بیان کیا' جو اخلاص

کے منافی ہیں (آل عمران ۳: ۱۵۲' التوبہ ۹: ۲۵' ۳۸) اور مشیت و تدابیرِ الٰہی کی کار فرمائی پر یقین میں اس حد تک اخلاص کی تعلیم دی کہ "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبیؐ' تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے' یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے" (الانفال ۸: ۱۷)۔

یہ بڑا نازک راستہ ہے۔ ایک طرف کامیابی مطلوب و محبوب ہونا چاہیے' کامیابی کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا چاہیے' بلکہ جان لڑا دینا چاہیے' اپنے ساتھ لانے کے لیے لوگوں کے پیچھے جانا چاہیے' لوگوں کو جوق درجوق دین میں داخل کرنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف ان میں سے کسی چیز کو فی نفسہٖ مقصود نہ ہونا چاہیے کہ معبودؑ کا درجہ حاصل کرے' اور معبودِ حقیقی سے غفلت و استغنا پیدا کردے۔

اس معاملہ میں افراد کی حد تک افراد ہی اپنا احتساب کرسکتے ہیں۔ اجتماعیت کی حد تک اجتماعیت کو کرنا چاہیے۔ ہمیں اس پہلو سے اپنے اندر بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ خدمتِ خلق کا کام کرتے ہوئے یہ جملہ زبان پر آ ہی جاتا ہے کہ "کتنی ہی خدمت کرلیں' مگر ووٹ نہیں دیتے۔" سمجھنے لگتے ہیں کہ تعداد و وسائل کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ کامیابیوں کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ دنیا کی محبت بھی ہے۔

کامیابی کے لیے للٰہیت شرطِ اوّلین ہے۔ دراصل ذکر تو یہی ہے کہ ہر وقت نگاہ وجہِ ربِ الاعلیٰ پر جمی رہے' اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جب مقابلہ ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد رکھو تاکہ کامیاب ہو۔ (الانفال ۸: ۴۵) ہم اللہ کے بن جائیں گے' تو اللہ ہمارا بن جائے گا۔ اللہ ہمارا بن جائے گا تو دنیا ہماری بن جائے گی' کہ لوگوں کے دل اس کی مٹھی میں ہیں' پل بھر میں جدھر چاہے پلٹ دے۔ جس طرح قتل کرنے کے لیے تلوار چلانا ضروری ہے' لیکن فرمایا گیا' تم نے قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے قتل کیا' اسی طرح لوگوں کو مسخر کرنے کے لیے تقریر' تحریر' جلسے جلوس' اشتہار ضروری ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان سے لوگ مسخر ہو جائیں گے یا ہوگئے۔ امام غزالیؒ کے الفاظ میں توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں' ترکِ رویتِ اسباب کا نام ہے۔

کامیابی کو محبوب رکھنا لیکن معبود نہ بنانا' اسباب اختیار کرنا مگر ان کو ارباب نہ بنانا' تدابیر اختیار کرنا مگر ان کو کارگر نہ سمجھنا --- یہ پل صراط سے زیادہ نازک راستہ ہے' لیکن نصرتِ الٰہی کے لیے ناگزیر ہے۔

۲ - کامیابی کے لیے دوسرا لازمی وسیلہ مومنین کا ایسا گروہ ہے جن کے دل الفت کے رشتہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں' جو سمع و طاعت اور نظم و ضبط کے پابند ہوں' جو بنیان مرصوص ہوں۔ هُوَالَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ "وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے" (الانفال ۸ : ۶۲' ۶۳)۔ فتح کی بشارت ایک ایسی جماعت کو دی گئی جو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کی تصویر ہو (الفتح ۴۸ : ۲۹)۔ باہمی الفت و رحمت کو خراب کرنے والی ساری چیزوں کو حرام کردیا گیا (الحجرات ۴۹ : ۱۰ تا ۱۲)۔ وحدت و استحکام کی خاطر اطاعت کا حکم دیا' اور باہمی تنازع کو حرام قرار دیا۔ فرمایا "اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں' ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (الانفال ۸ : ۴۶)۔ مزید فرمایا "اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا' وہ تو اس نے پورا کردیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا' اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت)' تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے --- اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے --- تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کردیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کردیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے" (آلِ عمران ۳ : ۱۵۲)۔

اس پہلو سے اپنا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر شکست نہ ہوتی تو تعجب کی بات ہوتی۔ سب نہیں' اکثریت بھی نہیں' لیکن ایک خاصی معقول تعداد' جس میں اکابر بھی ہیں اور اصاغر بھی' پرانے تربیت یافتہ بھی ہیں اور نوواردین بھی' ان سارے احکام کی خلاف ورزی میں ملوث رہی ہے۔

یہ کیفیت کوئی آج کی بات نہیں کہ موجودہ امارت' پاسبان اور فرنٹ جیسے مسائل کی وجہ سے ہو۔ پہلے سمع و طاعت اور نظم و ضبط تو رہا ہے' احتساب اور گردنیں پکڑنے کا رواج بھی رہا ہے' مگر الفت و محبت کی کمی ہمیشہ رہی ہے۔ اب ایک عرصہ سے مثالی نظم بھی ہاتھ سے جارہا ہے۔ لیکن پہلے بھی کسی جگہ جب اختلاف ہو جاتا --- افراد کے درمیان ذاتی ہو' اصول و احکام کی تعبیر میں ہو' تدابیر و مصالح کے تعین میں ہو --- پھر دیکھیے : دل کس طرح پھٹ جاتے تھے' مشہور

زمانہ نظم و ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے تھے' لب و لہجہ بدل جاتا تھا' سخت سے سخت الفاظ استعمال کرنے سے دریغ نہ ہوتا تھا۔

آج کی کیفیت کی ایک جھلک ۱۹۵۷ کے قائم مقام امیر جماعت چودھری غلام محمدؒ کے الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہے'

> بعض لوگوں نے شوریٰ کی کارروائیوں کے متعلق بالکل غلط اور بے بنیاد تاثرات دیے۔ بعض لوگوں نے قرار داد کے متن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو اس کی منشا کے خلاف تھی۔ بعضوں نے شوریٰ کے ارکان کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ . . بعض نے شدتِ تاثر میں اپنے جذبات پبلک پر ظاہر کردیے۔ ان ساری باتوں نے مل ملا کر چند دنوں کے لیے جماعت کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ لوگوں کے ذہن ہر طرح کی باتیں قبول کرنے اور ہر طرح کی باتیں پھیلانے کے لیے بے قید ہوگئے' اور شریعت اور اخلاق کے حدود کی بھی پروا بہت کم رہ گئی۔ (مرکزی سرکلر مورخہ ۱۶ جنوری' ۱۹۵۷)

اختلاف سے کسی تنظیم کو مفر نہیں' لیکن مضبوط نظم کے لیے الفت' سمع و طاعت' اور شوریٰ کے بعد سب سے زیادہ ضروری صفت تو یہی ہے کہ وہ اختلاف کو سہار جائے' اور لوگ اختلاف کے باوجود شیروشکر ہوکر' دو کناروں کے درمیان' اپنی منزل کی طرف رواں رہیں۔ تعبیرات کے اختلاف عقل و نقل کے استدلال کے علاوہ اور کس طرح حل ہوسکتے ہیں ؟ اس کے باوجود حل نہ ہوں' اور ان کا تعلق اجتماعی پالیسی سے ہو' یا دیگر پالیسی' تدابیر اور مصالح کے اختلاف ہوں' تو شورائیت کے علاوہ حل کا اور کیا راستہ ہوسکتا ہے ؟ یہی راستہ شریعت نے ہمیں بتایا ہے۔ افراد اپنے کو کتنا ہی برسرحق سمجھتے ہوں' یا واقعتاً ہوں بھی' اجتماعی فیصلوں کے آگے سرتسلیم خم نہ کریں تو پھر نزاعات کا کوئی حل ممکن نہیں۔ پھر تو' محترم نعیم صدیقی صاحب کے الفاظ میں "افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے . . . دل و دماغ میں زہریلے آبلے پڑ جائیں گے اور زندگی آگ کے شعلوں سے بھر جائے گی۔ وہ چہرے جن پر مسکراہٹوں کے پھول کھلنا چاہئیں' ان پر نفرت کے تارکول کا غبار چپک جائے گا۔ اس غبار کو اگر دنیا میں صاف نہ کیا جائے تو خدانخواستہ آخرت تک ساتھ جاسکتا ہے۔"

دلوں میں الفت کے بجائے دوری کا کیا عالم ہے ؟ شوریٰ اگر ان کی رائے اور مرضی کے مطابق فیصلے نہ کرے تو اسے ربراسٹمپ قرار دینے میں کوئی تامل نہیں' اخباری کالموں اور نظموں

میں دل کا غبار نکالنے سے بھی کوئی دریغ نہیں۔ فیصلوں کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش جائز ہوگئی ہے۔ اطاعتِ امر کی تعلیم دی تو یوں گئی کہ جب تک اربابِ امر "کتاب و سنت سے کھلم کھلا انحراف نہ کریں' ان کے احکام اور ہدایت سے سرتابی کرنا' یا ان کی اطاعت بہ طوع و رغبت کرنے کے بجائے بددلی کے ساتھ کرنا' یا ان کے لیے خیر خواہانہ جذبات رکھنے کے بجائے کینہ و نفرت کے جذبات دلوں میں رکھنا' ان کے خلاف سازشیں کرنا' ان کی غیبت کرنا' ان کے متعلق بددلی پھیلانا . . . یہ کچھ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے . . . ان کی وجہ سے . . . عاقبت تباہ ہو سکتی ہے"۔ پھر' کیا یہ سب کام نہ کیے گئے ؟ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِیْرَهٗ "بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے" (القیامہ ۷۵ : ۱۴' ۱۵)۔

شکست کے اسباب موسیقی' تصویر اور بھنگڑہ جیسے صغائر کے مقابلہ میں ان کبائر میں کیوں نہ تلاش کیے جائیں ؟ بلکہ یہ فہرست تو اور طویل کی جاسکتی ہے : گروہ بندی اور نجویٰ' بہتان اور افترا' تجسس اور بدظنی' بلا تحقیق الزامات پر یقین اور ان کی اشاعت' غیبت' ھمز اور لمز ---- اور سب سے بڑھ کر عہدِ رکنیت اور قواعد و ضوابط کی صریح خلاف ورزی۔ اجتماعی زندگی ان امراض کا شکار ہو' تو کامیابی کا خواب کیسے پورا ہو سکتا ہے ؟

۳ - یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کی معصیت کے ذریعہ اس کی رضا اور اس کی نصرت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اوپر ہم نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ سب تو کبائر کے زمرہ میں آتے ہی ہیں' اور بھی چند امور ہیں جن کا نوٹس لینا ضروری ہے۔

(الف) عدل و قسط کی شہادت اور اس کا قیام ہی دین کا اور اس امت کا مقصد ہے۔ اسی لیے عدل اور احسان کا امر کیا گیا ہے' کہا گیا ہے کہ جب بات کرو تو عدل کے ساتھ کرو اگرچہ خود اپنے نفس کے' یا اپنے قرابت داروں کے' یا اپنے گروہ کے خلاف بات جاتی ہو۔ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی بدترین دشمن کے ساتھ دشمنی بھی تمہیں عدل کے مقام سے نہ ہٹائے۔ بے لاگ عدل پر کاربند رہنے کے اس حکم کی خلاف ورزی بھی عرصہ سے کی جاتی رہی ہے۔

جن سے ہمارا سیاسی اختلاف ہوا' ہم نے ان کے خلاف بات کرنے میں عدل و احسان کے تقاضے یاد نہ رکھے۔ ہم بھی بلا ثبوت مخالفین کو غدار قرار دیتے رہے' اور ان پر ہر نوع کے الزامات عائد کرتے رہے۔ ان پر ظلم ہوا' ہم نے اپنے سیاسی مفاد میں اس ظلم کے خلاف زبان نہ کھولی۔ بینظیر بھٹو کی حکومت کو گرانے کے لیے نواز شریف نے ہارس ٹریڈنگ کی تو ہم خاموشی

اختیار کیے رہے۔ ۸۸ اور ۹۰ میں نگراں حکومتوں نے اپنا اقتدار اور اپنے وسائل کھلم کھلا ایک جماعت کو کامیاب کرانے کے لیے استعمال کیے' ہم نے کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کی۔

پیپلزپارٹی کے خلاف سارے الزامات تسلیم' لیکن کسی پارٹی کی دشمنی کو ایمان و عقیدہ کا جز بنا لینا خزفِ ایمان ہے' اور اس کے خلاف نفرت کا زہر گھول گھول کر پلانا دعوت کے مقام و اخلاق کے منافی۔ بلکہ یہ سیاسی حکمت کے بھی منافی ہے کہ ملک کی بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ مستقل نفرت و عداوت کا تعلق ہو۔ ہم یہ کام بھی کرتے رہے' یہاں تک کہ ایک دن آگیا کہ جب ہم نے اپنے ووٹ بینک کو سیاسی دشمنی اور دوستی سے بالاتر ہوکر اصول اور مفادِ ملی میں اپنا ساتھ دینے کے لیے پکارا' تو پیپلزپارٹی کی دشمنی میں خود جماعتِ اسلامی کے ووٹر نے جماعتِ اسلامی کو ووٹ دینے سے انکار کردیا۔

(ب) اللہ تعالٰی نے داعی کو جن اخلاق کی تعلیم دی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ فرعون سے بھی نرم بات (قولِ لیّن) کرو' عفو و درگزر کا شیوہ اختیار کرو' جاہلین سے اعراض کرو۔ اس نے خود جہاں لیڈروں پر تنقید کی تو سوائے ابولہب کے کسی کا نام لے کر نہیں کی اور یہ کہنے کے بجائے کہ فلاں اور فلاں تمھیں گمراہ کررہے ہیں' یوں کہا کہ "تم کو گمراہ کیا جارہا ہے۔" بتوں کو گالی دینے سے بھی روکا۔ اس اعتراف میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی انتخابی مہم میں ان داعیانہ اخلاق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔

(ج) تصویر اور موسیقی کا استعمال بھی اسی معصیت کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اختلافی مسائل ہیں' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے دیار کے علما ان کے منکر ہونے پر تقریباً متفق ہیں' اور عامتہ المسلمین کے ذہنوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو منافقت رائج ہے اس کی وجہ سے خواہ عوام خود تو رقص و موسیقی اور فلم و تصویر میں کتنے ہی بے محابا ملوث ہوں' مگر چاہتے ہیں کہ جو دین کا نام لیں وہ اجتناب کریں۔ خصوصاً وہ حلقہ جو تحریک کے متاثرین کا حلقہ ہے۔ اس لیے ضروری استعمال کے علاوہ اس انداز میں اور اس پیمانہ پر ان کا استعمال بھی صحیح نہ تھا۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جو اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جماعت کا دینی تشخص مجروح ہوگیا' اخلاقی ساکھ گر گئی' وہ سرفہرست تصویر' موسیقی' بھنگڑا' دھمال اور دیگر ثقاہت سے گرے ہوئے افعال کا ذکر کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے معصیت ہونے سے اختلاف کی گنجائش نہیں' مگر دینی تشخص کا سارا انحصار ان پر رکھنا بجائے خود ایک بگاڑ کی علامت ہے۔ اعمال میں ایک مدارج کا نظام ہے' اور سید مودودیؒ تو ہمہ وقت اس ظاہری دینداری کے مخالف

رہے جو ظاہری فروعیات کو اصل دین کا مقام دیے رہے' اور وہ کھوٹے سکوں پر اشرفی کی مہر لگانے کے بجائے زرِخالص کے سکے ڈھالنے کے داعی رہے۔ کیا نقضِ عہدِ رکنیت سے دینی تشخص مجروح نہیں ہوتا؟ کیا غیبت' جماعتی فیصلوں کے خلاف نجوئی اور اخباری بیانات اور کالموں میں مہم سے اخلاقی ساکھ نہیں گرتی؟ جو نوجوان ان منکرات میں ملوث ہوئے' اور جن کو ہم شدت سے روکتے رہے' وہ ہم کو پلٹ کر یہی جواب دیتے: "فلاں تربیت یافتہ بزرگ یوں سنی سنائی باتوں پر بہتان و اتہام کی اشاعت میں مشغول ہیں' فلاں فلاں بزرگ اخبارات میں جماعتی فیصلوں کے خلاف لکھ بول رہے ہیں' فلاں بزرگ جماعت کے قائدین کو ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں' فلاں امیر' امیرِجماعت کا نمائندہ ہونے کے باوجود' کھلم کھلا جماعتی فیصلوں کے خلاف بولتے ہیں۔ امیرِ جماعت کو بدلنے کی مہم بھی چلا رہے ہیں اور اپنے مناصب و منافع سے بھی چمٹے ہوئے ہیں۔ تو کیا ہم چھوٹے ہی گناہگار اور گردن زدنی ہیں؟ اگرچہ ایک غلطی سے دوسری غلطی جائز نہیں ہو جاتی' مگر فی الواقع ان کو جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اپنے ووٹ بینک کے ایک بڑے حصہ نے جناب نوازشریف کے حق میں ووٹ دیا۔ ان میں ارکانِ جماعت بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کی یہ توجیہ غلط ہے کہ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ فرنٹ بنانے کے مخالف تھے۔ کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر جماعتِ اسلامی اپنے پروگرام اور تشخص کی بنیاد پر الیکشن لڑ رہی ہوتی تو بھی نتیجہ یہی نکلتا۔ اگر اسلامک فرنٹ نہ ہوتا' اگر پاسبان اور اس کے کام نہ ہوتے' اگر انتخابی مہم میں ثقاہت سے گرے ہوئے انداز و اطوار اور پروگرام نہ ہوتے' اگر تصویر و موسیقی کا استعمال نہ ہوتا' اگر سرخ پٹی والے پرچم کے بجائے کلمہ طیبہ والا پرچم ہوتا' اگر ہم مہم بالکل ۱۹۷۰ کے انداز میں چلاتے' تب بھی نتائج آج یا ۱۹۷۰ سے مختلف نہ ہوتے۔ ۱۹۷۷ میں' ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں ہمارے ان ووٹرز کے دل جنہوں نے آج ان سارے الزامات کے بہانے نوازشریف کو ووٹ دیے' اس بات سے شق نہ ہوئے کہ اب ان کے ہاتھوں میں کلمہ طیبہ کے بجائے نوستاروں کا پرچم ہے جن میں بیگم ولی خان اور اصغرخان بھی شامل ہیں۔ یہ بات ان کے دین و ایمان پر گراں نہ گزری کہ ہم ان کو ووٹ دے رہے ہیں اور دلوا رہے ہیں جو صرف پایہ ثقاہت سے گری ہوئی حرکات کے مجرم نہیں' بلکہ شرابی' بدکار' اسمگلر' تارک فرائض' مرتکبِ کبائر' فاسق اور فاجر مسلمان ہیں۔ ان انتخابات میں فوٹو بھی تھے اور قدِ آدم تصاویر بھی' گانے بھی تھے اور رقص بھی

--- اور یہ سب "ہماری" پی این اے اور آئی جے آئی کے نمائندے تھے --- لیکن ہمیں ان منکرات کو نظرانداز کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں ہمارے ارکان کے قدِ آدم پورٹریٹ ان کے حلقوں میں آویزاں تھے' ان پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ ۱۹۹۰ میں بھی ماں بیٹی کے بارہ میں غلیظ الفاظ استعمال کیے گئے' مجھے صرف ایک دبادبا احتجاج موصول ہوا تھا۔ خدا کے لیے' آپ کوئی بھی موقف اختیار کریں' تضاد اور منافقت سے تو خود کو پاک رکھیں کہ سیّد مودودیؒ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہی سب کچھ ہوتا کہ جس کے خلاف آج کالم سیاہ کیے جارہے ہیں' اور جماعت کے بعض ارکان امیرِ جماعت کے خلاف مہمات چلارہے ہیں' لیکن صرف اگر قاضی حسین احمد ' نواز شریف کے ہاتھ' میں ہاتھ دے کر کھڑے ہوجاتے' تو ان سارے گناہوں پر پردہ پڑ جاتا' فرنٹ بھی قبول ہوتا اور اس کا پرچم بھی' پاسبان بھی اور اس کے نوجوان بھی' اور ظالم' بدکار و شرابی اور حرام کھانے والے امیدوار بھی سر آنکھوں پر ہوتے (بلکہ اب بھی اس کردار کے لوگوں کو ارکان تک نے ووٹ ڈالے)۔

اس بات کا احساس ضروری ہے کہ معیارِ حب و بغض' اللہ اور اس کے رسولؐ نہیں تھے' ان کے احکامات بھی نہیں' بلکہ صرف پیپلزپارٹی کی نفرت اور نواز شریف کی محبت تھی۔ "وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْعِجْلَ : اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا" (البقرہ ۲ : ۹۳) کی کیفیت تھی' اسی لیے "سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا : ہم نے سن لیا' مگر مانیں گے نہیں" (ایضاً) کی روش بھی ہوئی۔

صرف ان انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر فرنٹ کی ناکامی کا فیصلہ کردینا اور اس حکمتِ عملی کو ترک کردینا ایک سراسر غیر معقول روش ہوگی۔ ہاں' دوسرے دلائل کی بنیاد پر اس کی مخالفت بھی کی جاسکتی ہے اور حمایت بھی' ترک بھی کیا جاسکتا ہے اور جاری بھی رکھا جاسکتا ہے۔

اگر ہم حقیقت پسند ہوں تو جو اہم سوالات ہمارے غوروفکر کا مرکز بننا چاہئیں' اور جن سے نظریں چرا کر ہمیں اس مرحلہ سے نہیں گزر جانا چاہیے' ان میں نہ فرنٹ کے نام سے ایک سیاسی تنظیم کا قیام ہے' نہ پاسبان کی طرح کی ایک نوجوانوں کی تنظیم کا' نہ پاسبان کی روش اور ثقافت کا' نہ انتخابی مہم کا' نہ نواز شریف سے اتحاد اور مفاہمت کا۔

وہ سوالات یہ ہیں :

۱ - پہلا سوال یہ ہے کہ ہم نے چن چن کر اور چھانٹ چھانٹ کر' اور چھلنیاں لگا لگا کر اور

برسوں دروازوں پر کھڑا رکھ کر، یہ کیسے افراد پر مشتمل کیسی مثالی تنظیم بنائی ہے ؟ اور کیوں ؟

جہاں ہم تدبیر و حکمتِ عملی کے ایک سنگین اختلاف سے کامیابی سے نہیں گزر سکتے۔

جہاں اپنی رائے پر اتنا اصرار ہے کہ سارے ادارے ایک طرف، میری رائے ایک طرف، اس کو ضرور چلنا چاہیے۔

جہاں اللہ رب العالمین کو گواہ کر کے اقرار کرنے والوں کو کھلم کھلا احکامِ جماعت کی خلاف ورزی میں تامل نہیں۔

جہاں معاملات میں محرمات کے ارتکاب پر پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی، جہاں سود کی حرمت کے خلاف صدا بلند ہوتی رہتی ہے مگر سینما، موسیقی، تصویر ایسے کبائر بن گئے ہیں جو ناقابل برداشت ہیں۔

۲ - دوسرا سوال یہ ہے کہ ۵۲ سالہ جدوجہد کے بعد ہم نے یہ جو اتنا سکڑا ہوا اور ناقابل اعتبار حلقہ متفقین (ووٹ بینک) بنایا ہے، اس کی وجہ کیا ہے ؟ جو وسیع تر بینک ہم اپنا سمجھتے ہیں، اس کا بڑا حصہ کراچی میں پھسل کر ایم کیو ایم کی طرف چلا گیا، اور پنجاب میں نوازشریف کی طرف۔ اس کو اپنے سے زیادہ غیروں پر اعتماد ہے، ان سے محبت ہے۔ یہ ووٹ دیتے وقت سارے تطہیر شدہ افکار، نظریات، اور احکام شریعت کو فراموش کر سکتے ہیں۔ بات تلخ لگتی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ وفادار اور ثابت قدم تو پیپلزپارٹی کا ووٹ بینک ثابت ہوا، جو ۱۹۷۰ سے اسی طرح قائم ہے۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے وابستگان کو نازیوں اور فاشسٹوں کی قربانیوں اور اپنے مقصد سے وفاداریوں کی مثالیں دے کر ان کی غیرت کو جگایا ہے۔ ہم بھی یہ بات اسی مقصد کے لیے لکھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیپلزپارٹی کے ووٹرز کی وفاداری پر تو غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

۳ - تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہم نہ عامتہ المسلمین کو اپنے اندر جذب کرنے کو تیار ہوں، نہ ہم ان کی رائے کے مطابق سیاسی پالیسی اختیار کرنے کو تیار ہوں، تو پھر رائے عامہ کے بل پر تبدیلی لانے کی ایسی سیاست سے آخر کار کیا حاصل ہوگا۔

ان تین سوالات کے جوابات ہر اس شخص پر فرض ہیں جو تحریکِ اسلامی کے ذریعہ پاکستان

میں ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست وجود میں لانا چاہتا ہے۔

اخلاقی اسباب کے بعد حکمتِ عملی اور تدابیر بھی کامیابی و ناکامی میں اہم کردار ادا کردیتے ہیں۔ جیسا ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر فرنٹ اپنے بل پر ۱۰' ۱۵ سیٹ جیت لیتا' یا قاضی حسین احمد' ۸۸ اور ۹۰ کی طرح' ۷'۸ سیٹ کی بخشش پر راضی ہو کر' فرنٹ کو نواز شریف کے پہلو بہ پہلو لے جاکر کھڑا کردیتے' تو آج ہر خرابی نظر انداز کردی جاتی اور یہ تجزیئے اور کالم کہیں نظر نہ آتے۔ ہاں' ایک دوسرا طبقہ جماعت کے اندر' بادل گرفتہ اور چشمِ گریاں' ہمارا گریبان پکڑ رہا ہوتا۔ پھر ہم نے نواز شریف سے اتحاد کیوں نہ کیا۔ ہم اس سوال کا جواب تفصیل سے ستمبر ۱۹۹۳ کے شمارہ میں دے چکے ہیں۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں' یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مفاہمت تو ہو سکتی تھی' اگر اتحاد نہ ہوتا؟ پھر کیوں نہ ہوئی؟ دوسرے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ ہم نے نواز شریف کی ۱۵ تا ۱۹ سیٹیں چھین کر پیپلزپارٹی کے حوالے کردیں اور ملک پر ایک نسوانی اور مخالفِ اسلام حکومت مسلط کرادی۔

ا ۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے' تو ایک واقعہ کے رونما ہونے کے بعد اس کے بیانات ہمیشہ مختلف ہو جاتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں اپنی دانست میں صحیح صورتحال سامنے رکھ دیتے ہیں۔

(۱) جماعت کی قیادت آخر وقت تک' اپنا اصولی موقف قربان کیے بغیر' جناب نواز شریف سے مفاہمت کے لیے ذہناً" تیار تھی' کہ یہی عملی سیاست کا تقاضا تھا۔

(۲) جناب نواز شریف نے خود بھی یہ واضح اعلان کیا تھا کہ پاکستان مسلم لیگ تنہا انتخاب لڑے گی۔ وہ کسی کی محتاج نہیں' خود ہی دو تہائی اکثریت حاصل کرلے گی۔ ہاں چند پارٹیوں کو' اگر وہ ساتھ آنا چاہیں' ایڈجسٹ کرلیں گے۔

(۳) وزارتِ عظمیٰ سے ہٹنے کے بعد انہوں نے منصورہ آکر بات چیت کے لیے وقت لیا۔ لیکن "بدقسمتی" سے اسی دن انہیں "سن اسٹروک" ہوگیا۔ انہوں نے ایلچی بھیج دیے' خود معذرت کرلی مگر پشاور چلے گئے' سن اسٹروک کے باوجود۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی مفاہمت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے' ملاقات کی زحمت نہ اٹھائی۔ مفاہمت کی تالی دونوں ہاتھوں ہی سے بج سکتی تھی۔

(۴) پھر جب بھیجا' ایلچی بھیجا۔ ایک ایلچی سے پوچھا کہ آخر آپ کے پاس فارمولا کیا ہے؟

تو کہنے لگے' سات سیٹ لے لیجیے کہ یہ آپ کی تھیں۔ باقی کچھ چاہیے تو بات کرلیجیے۔ دوسرے جو بالکل آخر میں آئے' انہوں نے صاف کہا کہ ان کے پاس کوئی فارمولا نہیں۔ ان حالات میں' (i) جب کہ ہمیشہ کا تجربہ یہ تھا کہ ان کے امیدوار معاہدہ کے باوجود بھی بیٹھتے نہیں' بدنما جھگڑے چلتے رہتے ہیں' اور ہمیشہ یک طرفہ قربانی کا معاہدہ ہوتا ہے' اور (ii) مفاہمت میں کچھ چھوڑنے اور دینے کی گنجائش ان کے پاس نہ تھی' تو مفاہمت کس طرح ہوتی۔

(۵) مومن کو ایک سوراخ سے دو بار تو نہیں ڈسا جانا چاہیے۔ وہ قول و قرار کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ثابت ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۰ میں ہم نے ان سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمارے پارلیمنٹری لیڈر کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین بنا دیں۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ لیکن یہ وعدہ بھی' دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی درج کرنے کے وعدہ کی طرح' کبھی وفا نہ ہوا۔ چلیے' دستور کے لیے تو وہ کہتے ہیں ان کے پاس دو تہائی تعداد نہ تھی' (اگرچہ اس کے باوجود وہ آٹھویں ترمیم کے پیچھے استقامت کے ساتھ پڑے رہے' یہاں تک کہ اسی کے پیچھے اپنی وزارتِ عظمٰی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے) پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین کے لیے تو دو تہائی اکثریت درکار نہ تھی۔ جب یہ وعدہ پورا نہ ہوا' تو اب سیٹوں کے بارہ میں ان کے وعدوں پر کیسے اعتماد کیا جاتا؟ معاہدہ کے بعد وہ کہہ دیتے کہ مسلم لیگی نہیں مانتے اور بیٹھنے کو تیار نہیں۔

(۶) جماعتِ اسلامی کو شریک رکھنے کے بارہ میں ان کی روش دیکھیے۔ پنجاب میں ہم نے کابینہ میں ایک وزیر دے دیا۔ اس کو ایک چپراسی مقرر کرنے کا اختیار بھی نہ تھا۔ نہ وہ کسی مشورہ اور فیصلہ میں شریک کیا جاتا۔ اس تجربہ کی روشنی میں جب ہم نے مرکز میں وزارت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا تو ہمارے دوستوں نے بہت واویلا مچایا۔ گویا بس ایک وزیر دینے کی دیر تھی کہ سارے کام ٹھیک ہو جاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی سنجیدگی سے یہ نہ کہا کہ آپ آیئے' کابینہ میں شامل ہوں اور میری مدد کریں۔

(۷) مرکز میں ہم نے فیصلہ سازی میں شرکت کا حق مانگا کہ اہم قومی اور خارجی امور پر فیصلوں کے لیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی بنا دیں۔ چھ آدمی اپنے رکھیں' دو ہمارے۔ فیصلے آپ کثرتِ رائے سے کریں' لیکن بحث و تمحیص کے بعد۔ اس کے لیے وہ بالکل تیار نہ ہوئے کہ وہ وحدہٗ لاشریک اقتدار کے خواہاں تھے۔

(۸) وہ ہمیشہ یہ طعنے دیتے رہے کہ ۸ تو آپ کی سیٹیں ہیں' وہ بھی ہمارے رحم و کرم پر' حالانکہ ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہماری سیٹیں تو درویش کی چادر ہیں' رہی تو رہی' نہ رہی تو نہ

رہی۔ آپ کی وزارتِ عظمیٰ پھر ہاتھ نہ آئے گی۔

۹۔ اس وقت خود انھوں نے سنجیدگی سے مفاہمت کی کوشش کیوں نہ کی' جب کہ ان کی تو وزارتِ عظمیٰ داؤ پر لگی ہوئی تھی' اور پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی اصلی ذمہ داری ان کی تھی۔ اگرچہ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہ سنجیدگی سے مفاہمت کے خواہاں تھے۔

ہم آپ کو اس کا جواب بتاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بہت اونچا اڑ رہے تھے۔ وہ اس خیال میں مست تھے کہ جماعتِ اسلامی ساتھ آئے نہ آئے ان کو دو تہائی اکثریت مل جائے گی۔ آٹھ ممبران ہی درد سر تھے' مان کر نہ دیتے تھے' بڑھ گئے تو درد سر بڑھ جائے گا۔ ان کے حلقۂ یاراں نے بھی ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مفاہمت جماعتِ اسلامی کی اپنی ضرورت ہے۔ وہ خود سات سیٹ کی خاطر دم ہلاتی چلی آئے گی۔ آخر ۱۹۷۷ سے وہ ایسا ہی نہیں کرتی چلی آ رہی ہے؟ کچھ نہ ملا تو بھی اس نے ریفرنڈم میں ووٹ دیا۔ نہ آئی تو اس کے اکابرین اور قلم کار ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کا ووٹر ۱۹۷۷ سے ہماری جیب میں ڈالا جاچکا ہے۔ ان سب کے دباؤ سے آئے گی۔ قاضی حسین احمد پھر بھی نہ جھکے' تو ووٹر خود ون ٹو ون مقابلہ کردیں گے۔ جماعتِ اسلامی کے غبارہ سے ہوا نکل جائے گی۔ پھر قاضی حسین احمد کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرکے نکال باہر کیا جائے گا۔ پھر ایک نئی جماعتِ اسلامی بنے گی' جو کبھی آپ کے لیے درد سر نہ بنے گی۔ اس کا فلسفہ یہ ہوگا کہ ہم تو پچاس سال میں بھی زمامِ کار نہیں سنبھال سکتے' اس لیے مسلم لیگ کا دامن تھامے رہو' اور جو ملتا ہے وہ لے لو۔ وہ اس بھرّے میں آگئے' اور اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ پتہ نہیں وہ سابقینِ جماعتِ اسلامی جو کالم لکھ لکھ کر قاضی صاحب کو اپنے موقف پر استقامت سے قائم رہنے کا مشورہ دے رہے تھے' وہ پیپلزپارٹی کے ایجنٹ کا کام کررہے تھے۔ یا وہ سابقینِ پیپلزپارٹی جو ان کے اردگرد جمع ہو کر ان کو درج بالا پٹیاں پڑھا رہے تھے' وہ پیپلزپارٹی کے ایجنٹ کا کام کررہے تھے۔ اس کا فیصلہ شاید کبھی مورخ کردے' ورنہ علام الغیوب تو ضرور کردے گا۔

۲ - اب دوسرا بڑا اعتراض بھی لیجیے' کہ ہم نے ان کی ۱۵ تا ۱۹ سیٹیں چھین لیں' اور پیپلزپارٹی کو حکومت دلوا دی۔ اس سلسلہ میں بھی چند باتیں عرض ہیں۔

(۱) پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی ذمہ داری صرف جماعتِ اسلامی ہی کی تو نہ تھی' اگر اب یہ کوئی اہم دینی ذمہ داری رہ گئی تھی۔ پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی فکر اور ذمہ داری ان کی ہم سے کہیں زیادہ تھی کہ ان کا ذاتی مفاد اور ملک و ملت کا مفاد اس پر منحصر تھا۔ ہمارے سارے دوست جو پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں وہ ان سے کیوں نہیں پوچھتے اور ان

کا احتساب کیوں نہیں کرتے کہ انہوں نے پیپلزپارٹی کو کیوں آنے دیا ؟ صدر اسحاق اور فوج سے کیوں بگاڑی ؟ آٹھویں ترمیم کے پیچھے کیوں پڑے ؟ اسمبلی کیوں برخواست کی ؟ نومبر' دسمبر ۹۲ میں لانگ مارچ کی ناکامی کے بعد پیپلزپارٹی کو پھر سے قوت کیوں بنوا دیا ؟ آصف زرداری کو کیوں رہا کیا؟ تنہا پرواز کرکے اس کے مقابلہ میں جیتنے کے بجائے ہارنے کے راستہ پر کیوں گامزن ہوئے ؟

(۲) کچھ ایسا لگتا ہے کہ سیٹیں ان کی جاگیر تھیں' جو ان سے چھین لی گئیں۔ حالانکہ انتخابات میں ہرپارٹی اپنا منشور پیش کرتی ہے' اپنے ووٹ لیتی ہے۔ برطانیہ میں کوئی لبرل پارٹی پر الزام نہیں لگاتا کہ تم نے ہماری سیٹیں خراب کردیں۔ ہمارا اور ان کا منشور بھی ایک جیسا نہ تھا کہ کہا جائے کہ ہم نے ان کے ووٹ لے لیے۔

(۳) ہمارے ساتھ مفاہمت کرنے کی صورت میں ان کو جو کچھ مل سکتا تھا وہ ویسے بھی مل گیا۔ اکابر کی حمایت مل گئی' قلم کار مل گئے' ووٹر مل گئے۔ اب یہ فرض کرلینے کا کیا جواز ہے کہ جماعتِ اسلامی کا ہر ووٹ لازماً ان کے حق میں پڑ جاتا اور جن بچے کھچے ووٹرز نے ہمیں ووٹ دیے' ہم میدان میں نہ ہوتے تو وہ لازماً انہیں ووٹ دیتے۔ ہمارے ہاں خاصی بڑی تعداد ایسی ہے جو ان کو اور ان کے نمائندوں کو کسی صورت میں ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں۔

(۴) کیا ہم مفاہمت کرلیتے تو وہ یقیناً جیت جاتے ؟ واقعاتی شہادت اس کے خلاف ہے۔ ۱۹۸۸ میں تو قاضی صاحب ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قریہ قریہ گھومے تھے۔ پھر بھی وہ بمشکل پنجاب میں وزارت بنا سکے تھے۔ وہ بھی اس لیے بن سکی' اور قائم رہ سکی کہ صدر اور کمانڈر انچیف ان کی پشت پر تھے۔ اب آج نتائج ۹۰ کی طرح کیوں ہوتے' ۸۸ کی طرح کیوں نہ ہوتے۔ جب کہ نگراں حکومتیں ان کی پشت پناہ نہ تھیں۔

(۵) نواز شریف صاحب کو ایوانِ اقتدار سے باہر نکالنے کا بھی ہمیں کوئی شوق نہ تھا۔ نہ اس میں ہماری تسکین کا کوئی سامان تھا۔ ہم نے تو آخری وقت تک بھاگ دوڑ کی کہ وہ کسی طرح پانچ سال پورے کرلیں۔ وہ خود ہی نکلنے کے لیے بے تاب تھے' اور ایک کے بعد دوسرا گڑھا اپنے لیے کھودتے رہے۔ اب یہ خیال ضرور آتا ہے کہ جس نے اپنی بے تدبیریوں سے اپنا اقتدار اس آسانی سے گنوا دیا' کیا وہ ملکی مفادات کی حفاظت کرسکتا تھا؟

(۶) اور اگر کوئی اس بہتان و افترا پر اتر آئے کہ جماعت کی قیادت پیپلزپارٹی کو برسراقتدار لانے کا منصوبہ رکھتی تھی' تو وہ اس بات کا جواب بھی دے کہ پھر ۸۸ اور ۹۰ میں وہ نواز شریف صاحب کے دوش بہ دوش کیوں کھڑی ہوئی۔

(۷) بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اب پیپلزپارٹی اور جناب نواز شریف میں کوئی جوہری فرق رہ گیا تھا؟ ہم کو تسلیم ہے کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے' لیکن مضبوط دلائل کی بنیاد پر ہماری یہ رائے ہے' اور یہ دلائل ہم گزشتہ شماروں میں بیان کرچکے ہیں' کہ ایسا کوئی جوہری فرق نہیں رہ گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم یہ بات ووٹرز کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس سے ہماری بات غلط نہیں ہو جاتی۔ آخر بیس سال سے ۳۷ فیصد ووٹرز کے دل میں یہ بات بھی تو اتارنے میں کامیاب نہیں رہے کہ پیپلزپارٹی اسلام اور ملک کی دشمن ہے۔

درج بالا اعتراض میں کوئی وزن ہوسکتا ہے تو اسی وقت جب ہماری رائے کو غلط ثابت کردیا جائے' اور ہمارے دلائل کا جواب دلائل سے دیا جائے' ان کی پالیسیوں کے حوالے سے دیا جائے' خاندانی شرافت' نماز اور شیروانی کے حوالے سے نہ دیا جائے۔

(۸) آخری بات یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ میں جماعتِ اسلامی اس لیے تو نہ بنائی تھی کہ عورت "بینظیر" کو ہٹا کر مرد "بینظیر" کو اقتدار دلانے کے لیے اپنے اصول اور اپنا مقام سب قربان کردے۔ جماعتِ اسلامی تو غلبۂ اسلام کے لیے بنی تھی۔ اس معاملہ میں جناب نواز شریف کی روش ہمارے سامنے ہے'

○ انھوں نے بار بار اپنے فنڈا مینٹلسٹ ہونے کا انکار کیا ہے۔

○ انھوں نے ایک ایسا شریعت بل پاس کیا جو بعض لوگوں کی رائے میں کفرِ بواح پر مشتمل ہے۔

○ انھوں نے تعلیم کا محکمہ ایک سیکولر وزیر کے سپرد کیا' تو میڈیا کا ایک اباحت پسند وزیر کے۔ تعلیم ہمارے نزدیک سب سے اہم شعبہ ہے۔ انھوں نے پیپلزپارٹی کی تعلیمی پالیسی سرورق بدل کے ویسی کی ویسی ہی نافذ کردی۔

○ ان کے دور میں میڈیا جیسی "اسلامی" ثقافت کو ترویج دیتا رہا ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔

○ انھوں نے جب ۱۷ اپریل کو قوم کے سامنے اپنے کارنامے بیان کیے' تو ان میں اسلام کا نام بھی نہ تھا۔ یہ مقام تھا اسلام کا ان کی نظروں میں۔

○ اقتدار چھوڑتے ہوئے بھی انھوں نے صرف اسلامی فلاحی حکومت کا لفظ بولنا کافی سمجھا۔

○ اس کے بعد جس منشور پر انھوں نے انتخاب لڑا' اس میں سے قرآن و سنت کو خارج کرکے میثاقِ مدینہ اور خطبۂ حجتہ الوداع جیسے مبہم الفاظ ڈال دیے۔ یہ اسلام سے راہِ فرار تھی۔ حالانکہ ۹۰ میں تو وہ ببانگِ دہل نفاذِ شریعت کا اعلان کرتے رہتے تھے' کہ اس وقت حصولِ اقتدار کے لیے

وہی ضروری تھا۔

کیا جناب نواز شریف امریکہ کی سازش کے تحت نکالے گئے ؟ اور اس لیے نکالے گئے کہ پاکستان کا کشکولِ گدائی توڑ ڈالنے کی راہ پر گامزن تھے ؟ سبحان اللہ ! تو اس سلسلہ میں کچھ اعداد و شمار ہم اکتوبر کے شمارہ میں پیش کرچکے ہیں۔ قرضوں کا بار ان کے دور میں اور تیزی سے بڑھا۔ ملک کی معیشت تباہ ہوئی۔ ہر معاملہ میں انہوں نے امریکی فرمائشیں پوری کرنے کی امریکہ کو یقین دہانی کرائی۔ معاشی ترقی کے سلسلہ میں مزید گفتگو کسی آئندہ شمارہ میں کریں گے۔ اس لیے کہ ہماری نظر میں تو معاشی ترقی کے سارے مغربی ماڈل اور فلسفے ہی مسترد کردیے جانے کے قابل ہیں۔

اگلے شمارہ میں ہم انشاءاللہ جماعت کی مستقبل کی سیاسی حکمتِ عملی کے بارہ میں کچھ گفتگو کریں گے، اور اس کی تنظیم و تربیت کے بارہ میں بھی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے رفقا ہماری درج بالا اور آنے والی گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں گے۔ اس لیے کہ یہ نازک اور اہم سوالات ہیں، اور انکو حل کیے بغیر تحریک درپیش تہذیبی و تاریخی چیلنج کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

پاکستان کے انتخابی نتائج

اور ان میں

جماعتِ اسلامی کی پوزیشن

(یہ وہ تقریر ہے جو لاہور میں مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان نے ۱۰/ جنوری ۱۹۷۱ء کو کارکنانِ جماعت اسلامی کے اجتماع میں کی تھی)۔

کارکنانِ جماعت کو خطاب کرنے میں ابھی میں کچھ تامل کر رہا تھا' اور چاہتا تھا کہ انتخابات کے نتائج سے جو گرماگرمی پیدا ہوئی ہے وہ ذرا کچھ اور ٹھنڈی ہو لے' اس کے بعد اظہارِ خیال کروں' تاکہ نسبتاً پرسکون ماحول میں لوگ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے لیے تیار ہوجائیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ انتخابات کے نتائج جس طرح غیر متوقع طور پر نکلے ہیں' اس کی وجہ سے بہت سے ذہنوں میں ایک طرح کا اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ جو لوگ جماعتِ اسلامی کے ساتھ پہلے سے وابستہ رہے اور مدتوں سے اس تحریک میں کام کر رہے ہیں' ان کے دل تو خدا کے فضل سے ہر اضطراب سے محفوظ ہیں' وہ پوری طرح مطمئن ہیں کہ جس راستے پر ہم چل رہے تھے' ٹھیک چل رہے تھے۔ اسی راستے پر ہمیں آگے چلنا ہے' اور جو کامیابی ہمیں مطلوب ہے' وہ اسی راستے پر چلتے ہوئے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کے اندر تو کوئی اضطراب' کوئی بے چینی یا کسی قسم کی گھبراہٹ موجود نہیں ہے۔ لیکن ایک کثیر تعداد جو قریب کے زمانے میں اس تحریک سے وابستہ ہوئی ہے' اس کے اندر کچھ اضطراب پایا جاتا ہے۔ اور اس اضطراب کو بڑھانے میں وہ بہت سے تبصرے بھی حصہ لے رہے ہیں جو اخبارات و رسائل میں ان نتائج کے متعلق لکھے جا رہے ہیں۔ ان تبصرہ نگار حضرات میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جنہوں نے جماعتِ اسلامی کو' اس کے مقصد اور طریقِ کار کو' اور ان حالات کو جن میں جماعتِ اسلامی نے شکست کھائی ہے' اچھی

طرح نہیں سمجھا۔ وہ اس شکست کے اسباب پر طرح طرح کے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں جن سے اس بات کا امکان ہے کہ جو نئے لوگ جماعت کے ساتھ حال میں وابستہ ہوئے ہیں' ان کے ذہنوں میں کہیں پراگندگی پیدا نہ ہو جائے' اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ یہاں اپنے کارکنوں کو مخاطب کروں اور یہی بات جو میں کہہ رہا ہوں وہ جماعت کے تمام حلقوں تک پہنچا دی جائے تاکہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے سب لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ہم کس مقصد کے لیے اٹھے تھے۔ کیا طریقِ کار ابتدا سے ہمارے سامنے تھا' اس طریقِ کار کے لحاظ سے ہم اپنے مقصد کی طرف کس طرح پیش قدمی کرتے رہے ہیں اور آگے کس طرح ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔

میں مختصراً یہ بات بھی بتانا چاہتا ہوں کہ انتخابات میں حصہ لینے سے ہمارا مقصد کیا ہے۔ جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہمیں انتخابات میں حصہ نہیں لینا چاہیے تھا' یا نہیں لینا چاہیے' وہ دراصل ہمارے مقصد اور اس اسکیم کو نہیں سمجھتے جس پر عمل کرکے ہم اپنے مقصد تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں' ہم محض اسلام کی تبلیغ کرنے نہیں اٹھے ہیں' بلکہ اس لیے اٹھے ہیں کہ وہ نظام اپنی ہمہ گیر اور مکمل صورت میں عملاً قائم ہو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے۔ اسی مقصد کے لیے ہم نے جماعت کی تشکیل کی' قابلِ اعتماد سیرت کے آدمیوں کو ایک ایک کرکے جمع اور منظم کیا' پھر ان کی تربیت کرکے انہیں مزید آدمیوں کو ہم خیال بنانے کے لیے استعمال کیا' یہاں تک کہ یہ ایک ملک گیر جماعت بن گئی' اور لاکھوں آدمی ان سے متاثر ہو گئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جو جماعت وہ مقصد رکھتی ہو جس کی ابھی میں نے آپ کے سامنے وضاحت کی ہے' وہ صرف اتنے ہی کام پر اکتفا نہیں کر سکتی' بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ اس کام کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی طاقت حاصل کرنے کی بھی پیہم کوشش کرتی چلی جائے' تاکہ بالآخر وہ اس نظام کو بالفعل نافذ کر سکے جو اس کے پیش نظر ہے۔ اس غرض کے لیے ایک ممکنہ راستہ یہ تھا کہ خفیہ تحریک اور مسلح انقلاب کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ لیکن ابتداء ہی سے ہماری یہ رائے تھی کہ اس راستے سے کوئی پائیدار اور صحت مند تغیر واقع نہیں ہو سکتا جو پورے معاشرے اور اس کے نظام کو مستقل بنیادوں پر تبدیل کر سکے۔ اس کے بعد لامحالہ دوسرا راستہ یہی رہ جاتا تھا کہ جمہوری اور آئینی طریقوں سے ایک نظامِ زندگی کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنے کی بتدریج کوشش کی جائے' اور اس کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ جب بھی ملک میں انتخابات ہوں' ان میں حصہ لیا جائے' عام لوگوں کے سامنے معقول طریقوں سے اپنا پروگرام

پیش کیا جائے' رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کرنے کی تمام ایسی تدبیریں اختیار کی جائیں جو جائز بھی ہوں اور ہمارے وسائل و ذرائع کی حد تک قابلِ عمل بھی' اور عوام کے سامنے ایسے آدمی نمائندگی کے لیے پیش کیے جائیں جو اہل بھی ہوں اور قابلِ اعتماد بھی' تاکہ لوگ خود یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ پروگرام اور نمائندے ان کے لیے قابلِ قبول ہیں یا نہیں۔ ہمارے نزدیک بالغ رائے دہندگی سے بہتر کوئی طریقِ انتخاب اس مقصد کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسی طریقِ انتخابات میں ملک کے عام آدمی تک پہنچا جا سکتا ہے' اس میں معاملات کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے' اس کے ذہن کی تربیت کی جا سکتی ہے' اس کے اندر پروگراموں کی اور ان کے لیے موزوں آدمیوں کی پرکھ پیدا کی جا سکتی ہے اور اس کی رائے کو تیار کر کے پوری قومی زندگی میں وہ تبدیلی لائی جا سکتی ہے جو ہمیں مطلوب ہے۔ اسی لیے ہم ملک کے سیاسی نظام میں جمہوریت کے' اور بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر انتخابات کے ہمیشہ حامی بلکہ اس کے لیے کوشاں رہے ہیں اور ہمارے پیشِ نظر یہی رہا ہے کہ جو نظام ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ جمہوریت اور انتخابات کے ذریعہ قائم کیا جائے' لیکن ہم کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہے ہیں کہ اس راستہ سے مطلوبہ تغیر لے آنا کوئی قریبی اور سہل ُالحصول کام ہے' اور ایک دو انتخابات ہی میں اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک پیہم اور مسلسل سعی چاہتا ہے جس میں ہر انتخابات کے حاصل کردہ نتائج کو دوسرے انتخابات کے لیے استعمال کرنے کا سلسلہ جاری رکھنا ہو گا یہاں تک کہ بالآخر ہم قوم کی فیصلہ کن اکثریت کو اپنے حق میں ہموار کر لیں۔

پس جب یہ راہِ عمل ہمارے پیشِ نظر تھی تو آخر اس بات کی کیا معقول وجہ ہو سکتی تھی کہ جب ملک میں انتخابات کی نوبت آئی تو ہم خود پیچھے ہٹ جاتے اور دوسروں کو آگے لانے کی کوشش کرتے جیسا کہ ہمارے بعض خیر خواہ ہمیں مشورہ دے رہے ہیں۔ مجھے معاف کیا جائے' اگر میں پوچھوں کہ وہ دوسرے لوگ ہیں کہاں جو اس نظامِ زندگی کو واقعی قائم کر سکتے ہوں بلکہ اسے اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں' اور جنھوں نے اسے قائم کرنے کے لیے فی الواقع کوئی کام کیا ہو؟ اگر ایسے لوگوں کی نشان دہی کی جائے تو ہم خوشی سے اس کے لیے تیار ہیں کہ فصل ہم بوئیں اور کھیت ان کے حوالے کر دیں بشرطیکہ ہمیں یہ اطمینان ہو کہ وہ اس کھیتی کی حفاظت بھی کر سکیں گے اور اس کی فصل بھی کاٹ سکیں گے۔ ہم نے یہ فصل اپنے لیے نہیں بوئی تھی اور نہ اپنی خاطر اسے کاٹنا ہمارے پیش نظر تھا۔ اگر ہمیں یہ اطمینان ہوتا کہ یہاں کوئی ایسا ہے جو اس بوئی ہوئی کھیتی کو سنبھال بھی سکتا ہے اور کاٹ بھی سکتا ہے تو بڑی خوشی سے پیچھے ہٹ جاتے

اور کہتے کہ بسم اللہ آپ حضرات تشریف لائیں' اور یہ فصل حاضر ہے۔ لیکن ایسا کوئی گروہ یہاں موجود نہیں ہے۔ یہ گروہ بھی جو تیار ہوا ہے' تیس سال کی محنتوں سے تیار ہوا ہے اور اس کے اندر بھی اس ساری جانچ پرکھ اور نگہداشت کے باوجود جو قابلِ اعتماد سیرت کے لوگ جمع کرنے کے لیے کی جاتی ہے' گندے انڈے نکل ہی آتے ہیں جن سے اس کو صاف کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھلا وہ لوگ جن کے ہاں سیرت و کردار کی سرے سے فکر ہی نہیں ہے اس فصل کو کہاں سنبھال سکتے ہیں؟

ہمارے کچھ دوست کہتے ہیں کہ تم نے قوم کی نبض پر ہاتھ نہیں رکھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس قوم کی نبض پر ہاتھ ہم نے بھی رکھا' اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی رکھا۔ لیکن تشخیص و تجویز سب کی مختلف تھی۔ ہم نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک حکیم کی طرح یہ محسوس کیا کہ اس قوم کے اندر یہ یہ کمزوریاں اور یہ یہ بیماریاں موجود ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی کمزوریاں دور کریں' اس کی بیماریوں کا علاج کریں اور اس کے دکھوں کو دور کرنے کے لیے وہ تدبیریں اختیار کریں جن سے فی الواقع اس کے دکھ دور ہو سکتے ہوں۔ کچھ اور لوگ تھے جنھوں نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی کمزوریوں کو محسوس کیا اور یہ سوچا کہ ان کمزوریوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے' اس کی بیماریوں کا اندازہ کیا' اور ایک لالچی ڈاکٹر کی طرح یہ سوچا کہ اس بیمار کو کس طرح لوٹا جا سکتا ہے' اس کے دکھوں کو معلوم کیا اور یہ طے کیا کہ اس کی ہر دکھتی رگ کو ایک ایک کرکے دبا دبا کر پہلے اسے تڑپایا جائے اور پھر اس کے دکھ درد دور کرنے کے لیے طرح طرح کے جھانسے دے کر اسے بیوقوف بنایا جائے۔ اب اگر فیصلہ اسی پر ہے کہ مریض نے کس کو چھوڑ کر کس کے حوالے اپنے آپ کو کر دیا' تو فی الواقع وہ دردمند حکیم احمق تھا جس نے بیمار کے علاج کی فکر کی تھی' اور وہ سب عطائی دانشمند تھے جو اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ہم ایسی دانشمندی سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں' اور اس بات پر خوش ہیں کہ اس نوعیت کے مقابلے میں جس چیز کو حماقت سمجھا جا رہا ہے اسی کی توفیق خدا نے ہمیں عطا فرمائی۔ ہم اس قوم کا علاج کرنے اٹھے تھے۔ اسے بے وقوف بنانے کے لیے نہیں اٹھے تھے۔ قوم کا جو سمجھدار اور صاحبِ علم طبقہ تھا' اس کی اکثریت نے ہمیں واقعی معالج سمجھا' اور ہماری تائید کی۔ بھولے بھالے سادہ لوح عوام نے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ان لوگوں کو پسند کرلیا جو اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس پہلے تجربے سے ہم قطعاً مایوس نہیں ہیں۔ جو مقصد ہمارے پیشِ نظر ہے اس کی خاطر ہم پے در پے ایسے ہی تجربے کرتے رہیں

بقیہ بر صفحہ ۴۹

فہمِ قرآن: تفاسیر کی روشنی میں

ظالموں سے تعاون؟

... فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ○ (سورۃ القصص ۲۸: ۱۷)

... پھر میں کبھی نہ ہوں گا مددگار گنہ گاروں کا۔

(موضح الفرقان: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

... اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا۔

(تفہیم القرآن: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

معارف القرآن: مفتی محمد شفیعؒ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد سے دو مسئلے ثابت ہوئے۔

مسئلۂ اوّل یہ کہ مظلوم اگرچہ کافر یا فاسق ہی ہو اس کی مدد کرنا چاہیے' دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کسی مجرم ظالم کی مدد کرنا جائز نہیں۔ علماء نے اس آیت سے استدلال فرما کر ظالم حکام کی ملازمت کو بھی ناجائز قرار دیا ہے کہ وہ بھی ان کے ظلم کے شریک سمجھے جائیں گے اور اس پر سلف صالحین سے متعدد روایات نقل کی ہیں (کما فی روح المعانی)۔ کفار یا ظالموں کی امداد و اعانت کی مختلف صورتیں ہیں اور ان کے احکام کتبِ فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ احقر نے احکام القرآن میں بزبانِ عربی اسی آیت کے ذیل میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح لکھ دی ہے۔ اہلِ علم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

ضیاء القرآن: پیر کرم شاہ الازہری

آپ نے مژدۂ مغفرت سنا تو عرض کی' مجھے تیری عنایات کی قسم جو تو نے مجھ پر فرمائی ہیں'

آئندہ مجرموں کا معاون نہیں بنوں گا۔ اس آیت سے علماءِ اسلام نے یہ استدلال کیا ہے کہ ظالموں کی امداد اور ان کی خدمت ممنوع ہے۔ واحتج اهل العلم بهذه الاية على المنع من معونة الظلمة وخدمتهم (روح المعانی)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بھی سماعت فرمایئے ' من مشى مع مظلوم ليعينه على مظلمته ثبت الله قدميه على الصراط يوم القيمة يوم تزل فيه الاقدام ومن مشى مع ظالم ليعينه على ظلمه ازل الله قدميه على الصراط يوم تدحض فيه الاقدام (قرطبی)

یعنی جو شخص کسی مظلوم کی مدد کے لیے اس کے ساتھ چلے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن، جو قدموں کے پھسلنے کا دن ہے، اس کے قدموں کو پل صراط پر ثابت قدم رکھے گا اور جو شخص ظالم کے ساتھ اس کے ظلم پر اس کی مدد کرنے کے لیے جاتا ہے تو اس دن اس کے قدم پلِ صراط سے پھسل جائیں گے۔

تفہیم القرآن : سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

حضرت موسیٰؑ کا یہ عہد بہت وسیع الفاظ میں ہے۔ اس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ میں کسی مجرم فرد کا مددگار نہیں بنوں گا' بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ میری امداد و اعانت کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ ہوگی جو دنیا میں ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ابن جریر اور متعدد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک لیا ہے کہ اسی روز حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطع تعلق کرلینے کا عہد کرلیا' کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے خدا کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کسی ایماندار آدمی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظالم سلطنت کا کل پرزہ بن کر رہے اور اس کی حشمت و طاقت میں اضافے کا موجب بنے۔

علماءِ اسلام نے بالعموم حضرت موسیٰؑ کے اس عہد سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعانت سے کامل اجتناب کرنا چاہیے' خواہ وہ ظالم فرد ہو' یا گروہ' یا حکومت و سلطنت۔ مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی امیہ کی حکومت میں کوفے کے گورنر کا کاتب (سیکرٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاء نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے' رزق دینے والا اللہ ہے۔

ایک اور کاتب نے عامر شعبی سے پوچھا "اے ابو عمرو' میں بس احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں' فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں' کیا یہ رزق میرے لیے جائز ہے"؟ انہوں نے کہا "ہوسکتا ہے کہ کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کا مال ناحق ضبط کیا جائے' یا کسی کا گھر گرانے کا حکم دیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو۔" پھر امام موصوف نے یہ آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب نے کہا "آج کے بعد میرا قلم بنی امیہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہوگا۔" امام نے کہا "پھر اللہ بھی تمہیں رزق سے محروم نہ فرمائے گا۔"

ضحاک کو تو عبدالرحمٰن بن مسلم نے صرف اس خدمت پر بھیجنا چاہا تھا کہ وہ بخارا کے لوگوں کی تنخواہیں جاکر بانٹ آئیں' مگر انہوں نے اس سے بھی انکار کردیا۔ ان کے دوستوں نے کہا' آخر اس میں کیا حرج ہے؟ انہوں نے کہا' میں ظالموں کے کسی کام میں بھی مددگار نہیں بننا چاہتا (روح المعانی' ج ۲۰' ص ۴۹)۔

امام ابوحنیفہؒ کا یہ واقعہ ان کے تمام مستند سوانح نگاروں' الموفق المکی' ابن البزاز الکروری' ملا علی قاری وغیرہم نے لکھا ہے کہ انہی کی تلقین پر منصور کے کمانڈر انچیف حسن بن قحطبہ نے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا کہ آج تک میں نے آپ کی سلطنت کی حمایت کے لیے جو کچھ کیا ہے یہ اگر خدا کی راہ میں تھا تو میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے' لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں تھا تو میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید جرائم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

بقیہ : حکمت مودودیؒ

گے' اور آخر وقت تک ہماری کوشش یہی رہے گی کہ اپنی قوم کے عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرکے اسے صحیح فیصلہ کرنے کے قابل بنائیں۔ اس میں اگر کامیابی ہوجائے تو الحمد للہ اور اگر خدانخواستہ کبھی کامیابی نہ ہو' تو ہم اس پر راضی ہیں کہ خدا کے ہاں ہمارا نام امتِ محمدیہ کو بے وقوف بنانے والوں میں نہ لکھا جائے۔

انتخابات کے بعد ملک کی سیاسی صورتِ حال

جماعتِ اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۶ تا ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ملک کی سیاسی صورت حال پر درج ذیل قرارداد منظور کی:

"جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کا یہ اجلاس اس صورتِ حال پر اپنی تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران' اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ہونے والے حالیہ تیسرے انتخابات بھی ملک کو سیاسی بحران سے نکالنے میں ناکام ثابت ہو رہے ہیں۔ اسی اندیشہ کے پیش نظر جماعتِ اسلامی نے بروقت سابقہ صدر غلام اسحاق خان' سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف اور سابق لیڈر آف اپوزیشن محترمہ بینظیر بھٹو سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کرکے ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ باہمی تصادم سے گریز کریں۔ مفاہمت کی راہ نکالیں۔ مل جل کر کام کریں اور ملک کو پھر کسی نئے بحران سے دوچار کرنے کا سبب نہ بنیں۔ لیکن اس وقت ہمارا یہ مشورہ قبول نہ کیا گیا۔ باہمی محاذ آرائی بڑھتی گئی جو ہمارے اندیشہ کے مطابق اسمبلیاں ٹوٹنے پر منتج ہوئی۔

اسمبلیوں کی یہ برطرفی جس طریقے سے عمل میں آئی اس سے یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ گویا یہ پوری کارروائی کسی سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت انجام پائی ہے۔ پھر سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میاں محمد نواز شریف اور محترمہ بینظیر بھٹو ایک ایسے شخص کے بطور نگران وزیر اعظم کی تقرری پر باہم متفق ہوگئے جو عوام کے لیے اجنبی تھے اور جنہیں اسی مقصد کے لیے فوری طور پر سنگاپور سے اسلام آباد لایا گیا۔ وہ خود بھی . . . ورلڈ بینک سے منسلک رہے ہیں اور انہوں نے اپنی کابینہ کے لیے بھی اکثر ایسے افراد ہی کو چنا جن کا تعلق . . . بین الاقوامی اداروں سے رہا ہے۔ نگران کابینہ نے اپنی دستوری ذمہ داریوں اور اختیارات سے تجاوز کرکے بہت تھوڑے عرصہ میں بھرپور اعتماد کے ساتھ وہ تمام اقدامات کر ڈالے جو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کرانا چاہتے تھے۔

یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ انتخابات سے قبل نگران وزیر اعظم نے ملک کے "وسیع تر

مفاد" میں اپنا یہ قیمتی مشورہ بھی دے دیا کہ انتخابات کے بعد نواز شریف اور بینظیر مل کر مخلوط حکومت بنائیں۔ اس مشورہ نے ان شبہات کو تقویت دی کہ اقتصادی اصلاحات کی طرح آئندہ ملک کی سیاسی بساط بچھانے کے پیچھے بھی عالمی اداروں کی خواہش اور منصوبہ بندی کار فرما ہے۔

انتخابات کے دوران سیاسی عناصر کے درمیان باہمی محاذ آرائی میں کوئی کمی نہیں آئی اور ملک کم و بیش دو کیمپوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک میاں محمد نواز شریف کے حامی، دوسرے بینظیر کے حامی۔ لیکن اس شدید محاذ آرائی کے باوجود ان دونوں جماعتوں کے انتخابی امیدواروں پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ دونوں جماعتوں کے اکثر و بیشتر لوگ ایک ہی طرح کے لوگ ہیں۔ دونوں جماعتوں نے کم و بیش ایک جیسے ہی مفاد پرست' استحصال پسند' خود غرض اور بار بار اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے والے افراد کو ٹکٹ دیے جو ملک کے سیاسی عدم استحکام اور بدعنوانیوں کا سبب بنتے رہے ہیں۔

ان حالات میں ہم نے پاکستان اسلامی فرنٹ کے پلیٹ فارم سے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے قوم کے سامنے دیانت دار' باصلاحیت' باکردار اور نیک نام افراد کی ایک ٹیم پیش کی۔ ہم نے قریہ قریہ بستی بستی اور شہر شہر گھوم کر اہلِ وطن کو آگاہ کیا کہ اگر آزمائے ہوئے لوگوں کو دوبارہ آزمانے کی غلطی کی گئی تو ملک سیاسی بحران سے نہیں نکل سکے گا اور ان کے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے' لیکن اس وقت چونکہ بدقسمتی سے ووٹر دو گروہوں میں منقسم ہو چکے تھے اس لیے ہماری بات کو پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ اب الیکشن کے نتائج سامنے آ چکے ہیں۔ ان انتخابات نے سیاسی بحران کو حل کرنے کے بجائے مزید سنگین بنا دیا ہے۔ مرکز میں کسی پارٹی کو بھی قطعی اکثریت حاصل نہیں۔ وہاں جو حکومت بھی بنے گی مضبوط اور مستحکم نہیں ہوگی۔ یہی حال ملک کے سب سے اہم اور سب سے بڑے صوبے پنجاب کا بھی ہے۔ یہاں بھی کسی کو اکثریت حاصل نہیں۔ پنجاب کی صوبائی حکومت بھی کمزور اور چند ممبرانِ اسمبلی کے رحم و کرم پر رہے گی۔

صوبہ بلوچستان اور سرحد میں چھوٹی علاقائی اور صوبائی جماعتوں کو زیادہ کامیابی ملی ہے اور یہاں بھی حکومت کی تشکیل جوڑ توڑ ہی کے ذریعے عمل میں آ سکے گی۔ ملک کے حساس ترین صوبے سندھ میں گو پیپلزپارٹی کو اکثریت حاصل ہوگئی ہے' لیکن شہری علاقوں میں بھاری اکثریت ایم کیو ایم کو حاصل ہوئی ہے۔ ۱۹۸۸ کے تجربہ سے خدشہ یہی ہے کہ وہاں حکومت تو بن جائے گی' لیکن صوبہ کشمکش اور بدامنی کے چنگل سے نہ نکل سکے گا۔ ان حالات میں اس امر کی

ضرورت ہے کہ کشاکش کی بجائے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا جائے اور تمام تر توجہ شہری اور دیہی مسائل کو حل کرنے اور صوبہ میں یکجہتی' اخوت اور بھائی چارہ کی فضا پیدا کر کے اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے پر دی جائے۔

موجودہ حالات ملک کے عام شہریوں کے لیے شدید تشویش کا باعث ہیں۔ قوم گرانی اور بے روزگاری کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اور بدامنی کا شکار ہے۔ بھارت ہمیں مسلسل دھمکیاں دے رہا ہے اور اس نے مقبوضہ کشمیر میں مظالم میں اچانک بے انتہا اضافہ کر دیا ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر اپنے ایٹمی پروگرام کو منجمد کر دیں اور بھارت کی بالادستی قبول کر لیں۔ کشمیر میں بھی وہ اپنی مرضی کا حل مسلط کرنے کا خواہش مند ہے۔ دوسری طرف انتخابات کے نتیجہ میں نفرتوں میں اضافہ ہوا ہے اور دشمن چاہتا ہے کہ ہماری قومی یکجہتی' اخوت' باہمی الفت پر ضرب کاری لگا کر ہمیں ٹکڑیوں میں بانٹ دے۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس ان حالات میں انتخابات میں کامیاب ہونے والی دونوں بڑی پارٹیوں پر واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنا قومی فریضہ ادا کریں' ملک کو سیاسی بحران سے نکالنے کے لیے مثبت کردار ادا کریں۔ سودے بازی سے نہیں بلکہ صاف ستھرے طریقہ سے جسے اکثریت حاصل ہو جائے' اسے حکومت کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور اقلیتی پارٹی اپوزیشن کا مثبت کردار ادا کرے۔ ایک دوسرے کو نیچے گرانے کا پہلے جیسا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تو جمہوریت کی یہ رہی سہی بساط بھی لپیٹی جا سکتی ہے اور ملک پھر کسی آمریت کا شکار ہو سکتا ہے۔

پاکستان اسلامی فرنٹ سے متعلق ممبران اسمبلی' سپیکر' ڈپٹی سپیکر اور قائد ایوان کے انتخابات کے موقعہ پر علیحدہ رہے ہیں' لیکن ہم اسمبلیوں کے اندر اور باہر مثبت اپوزیشن کا کردار ادا کرتے ہوئے ہر مفید اور مثبت کام میں تعاون کریں گے اور ہماری کوشش ہو گی کہ ان انتخابات کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی اسمبلیاں اپنی دستوری مدت پوری کرنے میں کامیاب ہو سکیں' اور سب سے بڑھ کر ہم یہ کوشش کریں گے کہ اس ملک کے عوام اسلام کے پیغام کو زیادہ سے زیادہ سمجھیں اور اس ملک کی پالیسیاں اسلامی احکام سے ہم آہنگ ہوں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم نے اپنی انتخابی مہم میں جو پیغام قوم کو دیا تھا' وہ مبنی بر حق تھا اور آنے والا وقت اس کی قدر و قیمت کو مزید واضح کر دے گا۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ مرکز میں قائم ہونے والی حکومت' پاکستان کے دستور کے مطابق ملک و ملت کے بہترین مفاد کے حصول کی سعی کرے اور عوام کے مسائل حل

کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کرے' نیز بیرونی دباؤ کے آگے جھکنے کے بجائے ملک کی معاشی و سیاسی آزادی کا پورا تحفظ کرے۔ ایٹمی توانائی کے پروگرام کی تکمیل کرے اور کشمیر کے مسئلہ کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل کرنے کے لیے موثر جدوجہد کرے۔ نیز ملک میں تصادم کی سیاست کی جگہ رواداری اور افہام و تفہیم کے ذریعے جمہوری عمل کو مستحکم کرے۔

اس موقع پر ہم یہ حقیقت بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور اسلام کی بنیاد ہی پر قائم رہ سکتا ہے۔ اگر نئی حکومت نے قرآن و سنت کے احکام کو جاری کرنے اور خلافِ اسلام باتوں کو ختم کرنے میں کوئی کوتاہی دکھائی تو قوم اسے برداشت نہیں کرے گی۔ نیز دستور کی اسلامی دفعات کو بدلنے کی کوئی کوشش کی گئی تو اس کی مزاحمت کی جائے گی۔

بقیہ : مطبوعات

بہائی لٹریچر: اس لٹریچر کے پیکٹ میں ہمارے پاس تین کتب موصول ہوئیں!

(۱) حضرت بہاء اللہ: تصویب : محفلِ مقدس ملی بہائیان پاکستان' ناشر بہائی پبلشنگ ٹرسٹ' بہائی ہال' بزنس ریکارڈر' لاہور یا پوسٹ بکس نمبر ۷۴۲۰ کراچی۔

(۲) قیدی اور سلاطین' تدوین وغیرہ لجنہ ملی' نفحات اللہ' پاکستان' لاہور۔ ناشر' بہائی پبلشنگ ٹرسٹ' کراچی نمبر۵' پوسٹ بکس ۷۴۲۰۔

(۳) ثنائے بہاء۔ بہاء اللہ اور بہائیت کی شعری ثناء خوانی۔ شاعر: صابر آفاقی' باجازت محفل مقدس ملی' ناشر: ادبیات' مظفر آباد۔ صفحات ۱۰۳۔ قیمت ۷۰ روپے۔

نہایت اچھے معیارِ طباعت و اشاعت کے ساتھ ان نگارشاتِ بہائیت کو دیکھا۔ اور بے اختیار زبان سے نکلا: "ایں گل دیگر شگفت"۔ پاکستان کی مٹی بہت زرخیز ہے اور ہر فتنے کا بیج قبول کرنے اور اسے پروان چڑھانے کی خوبی رکھتی ہے۔ ذکری مذہب ہو کہ قادیانیت' الطاف کی ایم کیو ایم ہو یا جی ایم سید کی شرر بار فکر' سب کیلئے دامنِ وطن وا ہے۔ بلکہ "را" "موساد" "کے جی بی" "سی آئی اے" ' تخریب کاروں اور ڈاکوؤں' سب کے لیے یہاں محفوظ پناہ گاہ ہے۔

جب پہلے پہل بہائیت کے دفتر قائم ہونے لگے تو اس وقت واضح تھا کہ سیکولر مائنڈڈ دانشوروں اور سیاست بازوں اور صحافیوں کے اس جنگل میں یہ بیل خوب پھیلے گی اور پھولے گی۔ اب گویا نیا مرحلہ کار شروع ہوگیا ہے۔ ہم نے ان کتابوں کو فی الحال سرسری طور سے دیکھا' کیونکہ

ہمارے ایمان اور عقلی دلائل کی رو سے کسی نئے نبی کے ظہور کی گنجائش نہیں ۔ نہ باب اور بہاء اللہ کے ظہور پر کوئی عالمی رو چلی کہ نیا دورِ نبوت شروع ہو رہا ہے۔

جناب بہاء اللہ کو ۵ سال کی عمر میں خواب آیا کہ آپ ایک بیکراں سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں اور مچھلیوں کی بے شمار قطاریں آپ کے سر کے بالوں کو پکڑے آپ کے پیچھے پیچھے تیر رہی ہے۔ والد نے تعبیر یہ بتائی کہ یہ بچہ بڑا عظیم رہنما بنے گا۔ آگے بہت سی کہانیاں ہیں۔ "آپ ہی وہ موعود ہیں جس کی پیش گوئی آسمانی صحیفوں اور البیان میں دی گئی" (ثنائے بہا۔ ص ۳)۔ "جنوری ۵۲ سے مئی ۶۳ تک بغداد میں آپ پر فارسی و عربی میں کئی صحیفے نازل ہوئے" (ایضاً) موصوف نے ترکی اور ایران اور یورپ کے حکمرانوں اور پوپ پر کئی الواح نازل فرمائیں۔ (ص ۳، ۴) ایک دلچسپ جملہ "آپ کے سیاہ بال اور سیاہ داڑھی تقریباً کمر تک پہنچتی تھی۔" بالوں کی تو خیر مگر داڑھی کمر تک کس طرح پہنچتی ہے۔ (ص ۴) آپ کا کلام فارسی اور عربی میں تقریباً سو جلدوں پر مشتمل ہے (ص ۵)۔ گویا ہمارے مرزائے قادیان کی پچاس الماریوں سے بات آگے نکل گئی۔ حضرت بہاء اللہ کے چند آسمانی القاب ---- جمال مبارک، جمال قدم، (یا قدم) منجی اسم، اسم اعظم، بناء عظیم اور مکلم طور۔ (ص ۶) مکتوب جو ساتھ ہے، اس میں تعلیمات بہائی کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ ۱۲ کے ساتھ تو نمبر ہیں، بقیہ نمبر کے بغیر ہیں۔ مثلاً:

۱ ۔ ہر انسان کو تمام تقالید سے بے نیاز ہو کر خود سچائی کی تلاش کرنا اور اسے اختیار کرنا چاہیے۔ (مگر آپ نے تو پہلی تقلیدی بندشوں میں بابی بہائی شخصیتوں اور مذاہب کی نئی تقالید کے ردوں کا اضافہ کردیا۔ آپ کا عمل تو انسانوں کو آزادی سے سچائی تلاش کرنے میں رکاوٹ ہے۔ (تبصرہ نگار)

۲ ۔ حضرت بہاء اللہ پر نازل ہونے والا کلامِ الٰہیہ وسیع سمندر کی طرح ہے۔ ان کے کلام کی سو سے زیادہ جلدی (اصل میں ہونا چاہیے : "جلدیں"۔ تبصرہ نگار)

(بلانمبر) ہدایت ہمیشہ اقوال سے ہوتی رہی، مگر اس زمانے میں اعمال سے ہونی مقدر ہوئی ہے الخ۔ بہت لایعنی عبارت ہے۔ کیا پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف باتیں کیں اور عمل کو الگ رکھ دیا ؟ (نعوذ باللہ) یا اسوۂ انبیاء اور اسوۂ محمدیؐ بھی نمایاں نہیں ہے ؟

دوسری طرف آپ کے ہاں سے اقوال ہی کا طوفان بشکلِ تحریر اٹھ رہا ہے۔ اعمال اگر ہوں گے تو گملوں میں لگے پودوں کی طرح کہیں گیلریوں اور برآمدوں کی سیڑھیوں پر رکھے ہوں گے۔

لٹریچر میں جو شعری مجموعہ "ثنائے بہا" صابر آفاقی صاحب کی تخلیقات پر مشتمل ہے 'میں چاہتا تھا کہ اس کی جھلک دکھاؤں' مگر طوالت کا اندیشہ ہے۔ شاعری بحروقوافی کے لحاظ سے خوب اور باطل معنویت کے لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ مگر نامانوس الفاظ اور اصطلاحوں کے بوجھ سے ناقۂ سخن کی کمر ٹوٹی جارہی ہے۔ (ن میں)

جماعتِ اسلامی انصاف کے دروازے پر: از جناب سید معروف شاہ شیرازی۔ ملنے کا پتہ۔ ادارہ منشوراتِ اسلامی' بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ متوسط کاغذ پر کمپیوٹر کی طباعت' دبیز رنگین سرورق۔ صفحات ۱۶۸۔ قیمت ۴۳ روپے۔

محترم سید معروف شیرازی صاحب دینی علم سے بھی بہرہ مند ہیں اور جدید قانون کا بھی امتحان پاس کیا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے اس رٹ پٹیشن کی روئیداد پیش کی ہے جو ۱۹۶۴ء میں جماعت اسلامی پاکستان کو خلاف قانون قرار دینے کے حکومتی اقدام کے خلاف ہائی کورٹ میں کراچی بنچ میں ۲۲ فروری ۶۴ء کو دائر کی گئی تھی۔ شیرازی صاحب نے اس تاریخی استغاثہ کا ریکارڈ بڑی خوبی سے محفوظ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ حکومتی رویے کی جو تاریخِ واقعات جماعت کو خلافِ قانون قرار دینے کا باعث بنی' اس کو بھی کتاب کے ابتدائی حصے میں بیان کردیا ہے۔

بعونہٖ تعالیٰ یہ رٹ منظور ہوگئی اور حکومت کا اقدام غیر قانونی اور ناجائز قرار پایا۔ (ن ص)

بقیہ: رسائل و مسائل

مصرف "الغارمین" بھی آیا ہے اور حدیث میں بھی ہے۔ "**لا تحل الصدقة الا لخمسة لغاز فی سبیل الله عزوجل اولعامل علیه اولغارم**"۔ قبیصہ بن مخارق ہلالی کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے فریقین میں مصالحت کے لیے اپنے ذمہ ایک رقم لی ہے اور آپؐ سے اس میں اعانت کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا زکوٰۃ کی رقم آنے تک انتظار کرو (احمد' مسلم' نسائی' ابوداؤد)۔ اس لیے صورت مسئولہ کے سلسلہ میں زکوٰۃ دینا بلاشک و شبہ جائز ہے اور قرآن و حدیث کی نصوص سے ثابت ہے۔ (عبدالمالک)

تغیرِ زمانہ سے تغیرِ احکام

شیخ محمد الزرقا، پروفیسر قانون اسلامی، لا کالج، شام

فقہائے امت اور ائمہ مجتہدین کے ہاں یہ حقیقت بالکل مسلّم اور معروف ہے کہ ماحول اور زمانے کے تغیرات شریعت کے مصلحت اور اجتہاد پر مبنی قوانین پر نمایاں حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قوانین کا اصل مقصد عدل و انصاف کا قیام، مصالح کا حصول، اور مفاسد کا انسداد ہے۔ اس لیے حالاتِ زمانہ اور اخلاقِ عامہ سے ان احکام و قوانین کا گہرا تعلق ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بہت سے احکام جو خاص ادوار و حالات میں بے حد مفید ہوتے ہیں، حالات کے بدل جانے کے بعد وہی احکام غیر مفید بلکہ الٹے نقصان دہ بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے فقہائے متاخرین نے بہت سے مسائل میں اپنے مذہب کے ائمہ اور فقہائے متقدمین کے خلاف فتوے دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس اختلافِ فتویٰ کا اصل سبب ان کے دور کا اخلاقی انحطاط یا تمدنی انقلاب ہے۔ اس لیے اپنے پیشرووں سے ان کا یہ اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے، بلکہ خود متقدمین اگر ان کے زمانے میں ہوتے تو ان کا فتویٰ متاخرین کے مطابق ہوتا۔ اسی بنیاد پر فقہ کا یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا ہے کہ:

لا ینکر تغیرالاحکام بتغیرالازمان۔

زمانے کے حالات بدل جانے کے باعث احکام میں تبدیلی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

لیکن اس متفق علیہ اصول کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تمام فقہائے مذاہب اس بات پر بھی متفق ہیں کہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے صرف ان ہی احکام میں تغیر کیا جا سکتا ہے، جو اوّل تو اجتہاد سے تعلق رکھتے ہوں، ثانیاً ان میں بنائے اجتہاد محض مصلحتِ ملت ہو۔ ایسے اصولی احکام میں تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا، جو قرآن و سنت کے واضح نصوص پر قائم ہیں۔

مثلاً محرمات کی حرمت' لین دین کے معاملات میں فریقین کی رضامندی سے کیے ہوئے معاہدات کا خود پابند ہونا' تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار ہونا' اقرار کی ذمہ داری کا صرف اقرار کرنے والے تک محدود رہنا' ایذا رسانی کو روکنا اور جرائم کا قلع قمع کرنا' فساد کے ذرائع کو بند کرنا' حقوق کی حفاظت' ہر مکلف کا خود اپنے فعل اور اپنی غلطی کا ذمہ دار ہونا' اور بے گناہ کو گنہ گار کی جگہ سزا دینے کی اجازت نہ دینا' اور اسی طرح کے دوسرے اساسی امور جن کا قیام و بقا شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔ ان میں کسی قسم کے تغیروتبدل کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہی تو وہ بنیادی اصول ہیں جن کی تعلیم شریعت نے اسی لیے دی ہے کہ ان کے ذریعہ سے امتوں کے بگاڑ اور زمانے کے غلط رجحانات کاعلاج کیاجاسکے۔

البتہ ان اصولوں کو روبعمل لانے کے ذرائع ووسائل میں اور واقعات وحالات پر ان کی تطبیق میں' بدلے ہوئے حالات اور اختلاف زمانہ کا لحاظ کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر حق داروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے پہلے جو طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے وہ یہ تھا کہ ایک ہی قاضی معاملات کا فیصلہ کرتا تھا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس طریقہ میں موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ ترمیم کی جا سکتی ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک قاضی کے بجائے متعدد ججوں پر مشتمل ایک بنچ مقرر کی جائے اور ایک ہی عدالت کا فیصلہ آخری نہ ہو بلکہ اپیل کی عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ اس ترمیم کی وجہ اس دور میں تقویٰ اور ایمانداری کی کمی ہے جس کے باعث ایک ہی قاضی کو آخری فیصلہ کر دینے کے اختیارات دے دینے میں اندیشہ ہے کہ انصاف کے تقاضے کماحقہ پورے نہ ہوں۔

اس مثال سے یہ امرواضح ہے کہ شرعی قوانین میں حالات زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی تغیر کیوں نہ ہو جائے' بہرحال صاحب حق کے حق کا استقرار' مصالح کا حصول' اور مفاسد کا سدباب وہ شرعی اساسات ہیں جن کا ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ اور احکام کے تغیر کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ شارع کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع اور وسائل میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بالعموم ذرائع اور وسائل کو خود متعین نہیں کیا ہے تاکہ ہر زمانے میں مقاصد کے لیے بہتر سے بہتر اور کامیاب سے کامیاب تدابیر اختیار کرنے کی آزادی برقرار رہے۔

حالات زمانہ میں تغیر کی دو صورتیں

زمانے کے حالات میں جس تبدیلی کی وجہ سے شرعی احکام میں تغیر کرنا پڑتا ہے' اس کی

دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ یہ تغیر لوگوں کے فساد اخلاق' تقویٰ کے فقدان اور ضعف ایمان کے باعث ہو۔ اس قسم کے تغیر کو عام طور پر "فساد زمانہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

تغیر کی دوسری صورت یہ ہے کہ تمدن کی ترقی کی وجہ سے نئے نئے ادارے اور جدید قسم کی تنظیمات وجود میں آجائیں' اور نئے قوانین' نئے قواعد و ضوابط' اور جدید اقتصادی معاملات کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ یہ دوسری قسم کا تغیر بھی پہلی قسم کی طرح ان اجتہادی احکام کے تغیر کا سبب بنتا ہے جو اس سے قبل کے حالات میں اختیار کیے گئے تھے' اور جو موجودہ حالات کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے کہ تبدیل شدہ حالات میں سابقہ اجتہادی احکام کا برقرار رکھنا یا تو بے نتیجہ ہوگا یا نقصان دہ' اور ظاہر ہے کہ شریعت ان دونوں نقائص سے پاک ہے۔ شاطبیؒ نے اپنی کتاب الموافقات میں لکھا ہے کہ "شریعت بے مقصد احکام کا مجموعہ نہیں ہے۔" اس قول کی مزید تشریح آگے آئے گی۔ ذیل میں دونوں قسم کے تغیرات کے باعث احکام میں تغیر کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ مثالیں بیشتر فقہائے احناف کے فتاویٰ سے ماخوذ ہیں۔

فسادِ زمانہ کی وجہ سے تغیر

بعض مسائل جن میں فقہاء متاخرین نے اپنے مذہب کے ائمہ کے اجتہاد کے خلاف عمل کیا ہے اور اس اختلاف کا سبب انحطاط زمانہ کو قرار دیا ہے' یہ ہیں :

۱- مذہب حنفی کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ قرض کی ذمہ داری مقروض کی ذات پر عائد ہوتی ہے۔ اس کی املاک پر اس کے قرض کی براہ راست ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک مقروض اپنی املاک اور اپنے اموال میں جو تصرف بھی کرے وہ شرعاً درست ہوگا' اگرچہ اس پر قرض اس کے مملوکات اور اموال کی مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر مقروض اپنا سارا مال وقف کر دے اور قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھے تو بھی اس کا یہ وقف فقہائے حنفیہ کے نزدیک شرعاً جائز ہوگا' بشرطیکہ حکومت نے اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک نہ دیا ہو۔

یہ مذہب حنفی کا ایک قیاسی اصول تھا لیکن جب لوگوں کی نیتوں میں فساد آگیا اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا احساس کم ہوگیا' تو لوگوں نے قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے مال کو خود اپنی ذات پر یا اپنی اولاد پر اور سب سے آخر میں رفاہ عام کے کسی کام پر وقف کرنا شروع کر دیا۔ جب متاخرین فقہاء حنفیہ نے یہ صورتحال دیکھی تو سب سے پہلے مذہب حنفی

کے اس اجتہاد کے خلاف مولیٰ ابو السعود (ا) مفتی روم نے فتویٰ دیا کہ مقروض کا وقف صرف اسی قدر مال میں جائز تصور کیا جائے گا جو اس پر عائد شدہ قرض سے زائد ہو۔ اسی سلسلے میں انہوں نے سلطان کی جانب سے ایک حکم نامہ بھی جاری کرایا۔ ان کے زمانے اور بعد کے فقہاء نے اس اجتہاد اور اس حکم کو تسلیم کیا۔

فقہائے حنفیہ نے قرض خواہوں کے حقوق کے تحفظ کا جو انتظام کیا ہے وہ "وقف" ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ مقروض اگر قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے وقف کے علاوہ دوسرے طریقے مثلاً بیع یا ہبہ وغیرہ اختیار کرنے لگیں' جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے' تو ان کے اس قسم کے تصرفات کو بھی ناجائز قرار دیا جائے گا اور اگر قرض خواہوں نے مقروض کو ان تصرفات کی خود ہی اجازت نہ دی ہو تو ان تصرفات کو باطل کرانے کا انُ کو اختیار حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علت وقف کو باطل کردیتی ہے۔ بعینہٖ وہی ان تصرفات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس دور کے فقہاء نے صرف وقف ہی کے باطل ہونے کی صراحت اس وجہ سے کی ہے کہ ان کے زمانے میں قرض کی ادائیگی سے بچنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ تر رائج تھا۔ حنبلی فقہ کے لحاظ سے بھی ایسی حالت میں "وقف" نیز دیگر تصرفات کو ناجائز قرار دیا جائے گا اگرچہ یہ جزئیہ مذہب حنبلی کے معروف اصول کے خلاف ہوگا۔

۲ - مذہب حنفی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ مال مغصوب کی مدد سے حاصل کردہ نفع کی قیمت کی ادائیگی غاصب کے ذمہ نہیں ہے۔ صرف اصل کی واپسی' اور اگر اصل برباد ہوگئی ہو یا خراب ہوگئی ہو تو اس کی قیمت کی ادائیگی' غاصب کے ذمہ ہوگی۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک نفع کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ کرائے کی شکل میں نفع کی مقدار کا جو تعین کیا جاتا ہے وہ اس معاہدے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کرائے اور مالک کے درمیان طے پاتا ہے۔ غصب کی صورت میں اس قسم کا کوئی معاہدہ عمل میں نہیں آتا' اس لیے نفع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن متاخرین نے جب غصب کے معاملے میں لوگوں کی دلیری اور دینی احساس کی کمی دیکھی تو انہوں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ غصب کردہ مال اگر وقف کا یا کسی یتیم کا ہو یا کسی نفع آور کام کے لیے مخصوص کیا جاچکا ہو' تو غاصب مدت غصب کے نفع کا تاوان ادا کرے گا۔ مذہب حنفی کے اصول کے خلاف یہ فتویٰ لوگوں کو ظلم و زیادتی سے روکنے کے لیے دیا گیا۔ اس کا بنیادی سبب زمانے کا بگاڑ ہے۔ متاخرین کے زمانے میں اسی فتوے پر عمل در آمد کیا جانے لگا۔

اسی علت پر قیاس کرتے ہوئے حنفی اجتہاد کے قواعد میں یہ اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ

تین قسم کے اموال مغصوبہ کے علاوہ دوسرے قسم کے اموال کے نفع کا تاوان بھی غاصب کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ اس زمانہ میں نیتوں کا فساد اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آج کل دوسروں کے مال پر لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں اور حقوق ادا کرنے میں پہلو تہی عام ہوگئی ہے۔ مزید برآں ہر قسم کے اموال مغصوبہ سے حاصل کردہ نفع کے تاوان کی ذمہ داری غاصب پر عائد کرنا آج کل کے قوانین کے مطابق بھی ہے اور مصالح کا تقاضا بھی یہی ہے۔

۳ - مذہب حنفی کا ایک اور اصول یہ ہے کہ اگر بیوی کو مہر معجل ادا کردیا جائے تو شوہر اسے جہاں چاہے لے جاسکتا ہے۔

لیکن جب اخلاقی انحطاط بڑھ گیا' ظلم و زیادتی کی کثرت ہوگئی' اور لوگ اپنی بیویوں کو دور دراز ملکوں میں' جہاں بیوی کے اعزہ میں سے کوئی نہیں ہوتا ہے' لے جاکر ان کے حقوق غصب کرنے لگے' اور ان پر ہر قسم کے مظالم توڑنے لگے' تو متاخرین نے اس صورت حال کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیا کہ' خواہ عورت کو مہر معجل ادا کردیا گیا ہو' اس کو اپنے وطن سے یا جہاں پر عقد ہوا ہے وہاں سے دور دراز کے ملکوں میں جانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فتویٰ بھی "فساد زمانہ" اور اخلاقی بگاڑ پر مبنی ہے اور اسی لیے یہی قول فتویٰ کا مدار قرار پایا' اور قاضی اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔

۴ - فقہ حنفی کا ایک اصول یہ ہے کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر بھی مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ یعنی متنازعہ فیہ معاملات میں محض قاضی کا علم بھی فیصلے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ مدعی کو اثبات دعویٰ کے لیے شہادت کی ضرورت نہیں ہوگی' بلکہ قاضی کا علم ہی شہادت کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے بعض فیصلے بھی اسی اصول کی نظیر کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ دیکھا گیا کہ تقویٰ اور دیانت کے لحاظ سے اس پائے کے قاضی باقی نہیں رہے کہ ان پر اتنی زبردست ذمہ داری ڈالی جاسکے' بلکہ فساد نیت' بددیانتی اور رشوت کی مثالیں بھی ملنے لگیں۔ علاوہ ازیں قاضیوں کے انتخاب اور تقرر میں دیانت' امانت اور صلاحیت کے بجائے حکام رسی' چاپلوسی اور خوشامد معیار بن گئی۔

اس صورتحال کے پیش نظر متاخرین کا یہ فتویٰ ہوا کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر مقدمات میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنا فیصلہ صرف ان مستند شہادتوں کی بنیاد پر کرے جو عدالت میں باقاعدہ پیش کی جاچکی ہوں۔ حتیٰ کہ قاضی نے عدالت کے باہر اگر کسی معاہدے یا قرض کا معاملہ یا کسی اور واقعے کا مشاہدہ خود کیا ہو' اور فریقین میں سے

کوئی مدعی کی صورت میں اسی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرے' اور فریقِ ثانی مدعی کے دعویٰ کا انکار کرے' تو قاضی شہادت کے بغیر فیصلہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔

اس فتوے کا سبب یہ ہے کہ قاضیوں کو فسادِ نیّت کے باوجود اگر ان کے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے' تو اندیشہ ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی پاسداری کرنے لگیں' اور جس کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ قاضیوں پر اس پابندی سے اگرچہ اس بات کا خطرہ ہے کہ بعض حقداروں کے حقوق شہادت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ان کو نہ مل سکیں' لیکن دوسری طرف بہت سی غلط کارروائیوں کا انسداد اسی طریقے پر ممکن ہے۔ چنانچہ اس امر پر اب تقریباً اتفاق ہوگیا ہے کہ قاضی اگر اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا۔

البتہ نزاعی مقدمات کے علاوہ دیگر ایسے معاملات جو محض خیر کا پہلو رکھتے ہوں یا ان کی حیثیت انتظامی امور کی ہو یا ان کی نوعیت محض احتیاطی تدابیر کی ہو' ان میں قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر کوئی اقدام کرسکتا ہے۔ مثلاً قاضی کو اگر علم ہوجائے کہ زوجین کے درمیان شرعاً جدائی ہوچکی ہے لیکن عملاً دونوں کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے ہیں' تو اسے یہ اختیار ہے کہ وہ زوجین کے درمیان عارضی طور پر تفریق کرا دے۔ اسی طرح اسے اگر کسی مال کے متعلق معلوم ہوجائے کہ وہ مالِ مغصوبہ ہے تو وہ اسے تا فیصلہ عدالت کسی امین کے پاس جمع کرا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

۵ - مذہبِ حنفی کے مبادیات میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک کام اگر کسی شخص پر فرض ہو' تو وہ اس فرض کی ادائیگی پر نہ کوئی اجرت لے سکتا ہے اور نہ کسی سے ایسی اجرت کا معاملہ کرسکتا ہے۔ اسی اصل سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اگر غاصب' غصب شدہ مال کو غصب کے مقام تک واپس لانے کی اجرت طلب کرے اور اصل مالک اجرت دے دے تو' غاصب کے لیے وہ اجرت جائز نہ ہوگی۔ اور قاضی اجرت کو واپس دلائے گا۔ اسی طرح اگر بیوی گھر کے فرائض واجبہ کی ادائیگی سے انکار کردے' اور شوہر اس کے بدلے میں اسے تنخواہ یا اجرت دے' تو یہ لین دین کا معاملہ درست نہ ہوگا اور بیوی کو اجرت لینے کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ امامت' خطبۂ جمعہ' تعلیمِ قرآن اور اس قسم کے فرائض دینی کی بجا آوری پر اجرت لینا جائز نہیں۔ جو ان فرائض کی انجام دہی پر قادر ہو اسے بلامعاوضہ یہ خدمت انجام دینی چاہیے کیونکہ یہ اس کے ذمے ایک دینی و شرعی فریضہ ہے۔

لیکن متاخرین نے دیکھا کہ ان فرائض کی ادائیگی میں لوگ بے حد سہل انگاری سے کام لینے

لگے ہیں' بیت المال سے علماء کے وظائف بند ہوگئے ہیں اور وہ کسبِ معاش کی طرف اپنی توجہات منعطف کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ حتیٰ کہ صورتِ حال ایسی ہوگئی ہے کہ اگر ان فرائض کی ادائیگی کے لیے اجرت قبول کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو سرے سے ان فرائض کی بجا آوری ہی موقوف ہوجائے گی۔ اس صورتحال پر نگاہ رکھتے ہوئے فقہاء نے اس قسم کے فرائض پر اجرت لینے کی اجازت دے دی' تاکہ تعلیم قرآن' علم کی نشرواشاعت اور شعائرِ دینی کی حفاظت کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

۶ - فقہاء کے ہاں یہ اصول بھی مسلّم ہے کہ قانونِ شہادت کی رو سے گواہوں کا عادل ہونا ضروری ہے۔ عادل ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ شاہد فرائض کا پابند اور صدق و امانت میں مشہور ہو۔ گواہوں کے لیے مذکورہ شرائط قرآن و سنت کی تصریحات اور فقہاء کے اجماع سے ثابت ہیں۔ لیکن فقہاءِ متاخرین نے یہ محسوس کیا کہ شریعت نے جس قسم کی عدالت کا مطالبہ کیا ہے وہ آج کل بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ زمانہ بگڑ چکا ہے' نیتوں میں فساد پیدا ہوگیا ہے اور دینی احساس میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ اس لیے قاضی اگر اس دور میں بھی کامل العدالتہ گواہوں کا مطالبہ کریں تو بہت سے حق دار اپنے حقوق سے محض اس وجہ سے محروم رہ جائیں گے کہ مطلوبہ شہادت فراہم کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔

اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے "الامثل فالامثل" کا اصول اختیار کرلیا۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ موجود ہوں' ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اس کی شہادت پر فیصلہ کرنا جائز ہوگا' اگرچہ وہ شہادت فی نفسھا شریعت کے معیارِ کامل کے مطابق نہ ہو۔ گویا کہ بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے فقہاء نے "مطلقِ عادل" کی شرط کے بجائے "مقابلتہ" عادل" ہونے کی شرط کو قبول کرلیا۔ اس طرح انہوں نے ایک اصول میں اضافی اور جزوی ترمیم کرکے ایک بڑے اور اہم تر اصولِ شریعت کو پامالی سے بچالیا۔

۷ - اسی طرح فقہاءِ متاخرین نے رمضان اور عیدین کے چاند کے لیے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو افراد کی شہادتوں کو کافی قرار دیا ہے' حالانکہ قدیم مذہبِ حنفی یہ ہے کہ اگر مطلع گردوغبار' اور ابروباد اور کہر وغیرہ سے پاک ہو تو رویتِ ہلال کے لیے دو آدمیوں کی شہادت کافی نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہت بڑی تعداد کا چاند دیکھنا ضروری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بکثرت لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں اس لیے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو آدمیوں کا چاند دیکھنا بعید از قیاس ہے' اور ان کی شہادت میں غلطی اور شبہ کا امکان ہے۔ اس

کے برعکس متاخرین نے دو آدمیوں کی شہادت قبول کرلینے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت کم لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے صرف دو آدمیوں کی شہادت کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ بشرطیکہ وہ شاہد عادل ہوں اور ان کی گواہی شک و شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ ان بہت سے مسائل میں سے چند مسائل ہیں جن میں فقہاء کے فتوے اور قاضیوں کے فیصلے تبدیل ہوگئے۔ یہ تغیر نقطہ نظر یا اصولِ فقہ میں کسی تبدیلی کی وجہ سے واقع نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کا سبب محض زمانے کا انحطاط، عام فسادِ اخلاق، ادائے فرض میں کوتاہی اور دیانت و حق شناسی کا فقدان ہے۔

تمدن کی ترقی اور ذرائع و وسائل میں تبدیلی کے باعث تغیر

زمانے کے اخلاقی انحطاط کے علاوہ دوسری اہم شے جو احکامِ اجتہادیہ پر اثر انداز ہوتی ہے، وہ معاشرتی و تمدنی حالات کی تبدیلی اور معاشی و اقتصادی وسائل کا ارتقا ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

۱ - جب تک زمینوں کی پیمائش اور ان کے نمبروں وغیرہ کا تعین نہیں ہوا تھا، اس وقت تک یہ طریقہ رائج تھا کہ قابلِ فروخت جائیداد اگر سامنے موجود نہیں ہوتی تھی تو بیع کی صحت کے لیے زمین کے حدود و اربعہ کی وضاحت ضروری ہوتی تھی، تاکہ وہ ملحقہ اراضی سے ممیز ہوجائے۔ اس طرح سے مالِ فروخت کے معلوم ہونے کی شرط پوری ہو جائے۔ لیکن آجکل چونکہ اکثر ملکوں میں زمین کی پیمائش ہو چکی ہے، ریکارڈ کے باقاعدہ دفاتر قائم ہوچکے ہیں، اور قطعاتِ اراضی کی پیمائش کے بعد ان کے نمبرات کا تعین کیا جاچکا ہے، اس لیے اب کسی جائیداد کو فروخت کرتے وقت صرف اس کے نمبر کا ذکر کردینا کافی ہوگا اور حدودِ اربعہ کی وضاحت کی ضرورت نہ ہوگی۔ جائیدادوں کی بیع و شرا کے وقت آج کل محض ریکارڈ کے نمبروں کا ذکر کردینا عین حکمتِ تشریع کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ زمانے کے ترقی یافتہ ذرائع نے امتیاز کا ایک ایسا طریقہ دریافت کرلیا ہے جو تعین کے اعتبار سے حدودِ اربعہ کے مقابلہ میں سہل تر اور صحیح تر ہے۔ اگر حدودِ اربعہ کی وضاحت کو اب بھی بیع کی شرطِ لازم قرار دیا جائے تو یہ ایک فعلِ عبث ہوگا اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے شریعت میں فضول اور بیکار باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔ [یہ تعین اب بھی عموماً کی جاتی ہے] -

۲ - اسی طرح فروخت کردہ جائیداد پر خریدار کو قبضہ دینے کے سلسلے میں پہلے یہ ضرور سمجھا جاتا تھا کہ بیچنے والا جائیداد کا باقاعدہ قبضہ خریدار کو دلادے، یا چابی وغیرہ اس کے حوالے کردے۔

اگر بیچنے والا اس طرح خریدار کو قبضہ نہ دلائے تو جائیداد بیچنے والے ہی کے قبضے میں سمجھی جائے گی اور اگر اس دوران میں جائیداد تباہ ہو جائے یا اسے کچھ نقصان پہنچے تو اس کا ذمہ دار وہی ہوگا' جیسا کہ قبضہ کے بغیر بیع کی صورت میں عام فقہی قوانین کا تقاضا ہے۔ لیکن جب غیر منقولہ املاک کی رجسٹریشن کا قانون بن گیا' تو قبضہ دلانے کے لیے یہ بات کافی ہوگئی کہ بیعنامہ کو رجسٹری کرالیا جائے۔ چنانچہ قاضی اسی اصول پر فیصلے کرنے لگے کہ تاریخ رجسٹری کے بعد فروخت شدہ جائیداد کی تباہی کی ذمہ داری بائع کی بجائے مشتری کی طرف منتقل ہوجاتی ہے کیونکہ رجسٹری کے ذریعہ قبضہ دلانا عملی قبضہ دلانے سے زیادہ موثر ہے۔ غیر منقولہ جائیداد میں اصل اعتبار اس شخص کا ہے جس کا نام بحیثیت مالک دفتر میں درج ہو' نہ کہ ان ہاتھوں کا جو اس جائیداد کا انتظام کر رہے ہوں۔ جب بائع نے ایک بار اپنی جائیداد کو فروخت کر کے رجسٹری کرا دی' تو وہ اب کسی اور شخص کے ہاتھ وہی جائیداد فروخت نہیں کرسکتا' کیونکہ دفترِ رجسٹرار میں اس کا نام بحیثیت مالک درج ہی نہیں ہے۔ اسی طرح حقِ بیع کے علاوہ باقی تمام حقوقِ ملکیت بھی مشتری کو رجسٹریشن کے بعد حاصل ہوجاتے ہیں۔ مثلاً وہ جائیداد کے منتظمین اور متصرفین کو تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہوجاتا ہے۔ ان دلائل سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ دفتری نظم و نسق میں ترقی کے باعث یہ چیز روحِ شریعت کے بالکل مطابق ہے کہ بیعنامہ کی رجسٹری عملی قبضہ دلانے کے قائم مقام قرار دی جائے۔

بنیادی اصول

یہ اور اس طرح کی دوسری مثالوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ تغیر زمانہ سے تغیر احکام کے اصول کو محض "عرفِ عام" کے نظریہ پر محمول کرنا درست نہیں ہے' جیسا کہ بعض محققین نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ قاعدہ درحقیقت "مصالحِ مرسلہ" (۲) کے اصول سے ماخوذ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں پہلو تہی' نیتوں کا فساد' تقویٰ کا فقدان' طمع کی کثرت' اختراعاتِ جدیدہ اور تمدن کی ترقی وغیرہ امور "عرفِ عام" کی قسم کی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر لوگ عام طور سے آپس میں معاملہ کرتے ہوں' بلکہ دراصل ان میں سے بعض اخلاقی زوال کا نتیجہ ہیں' اور بعض تمدن کی ترقی کا تقاضا ہیں' اور یہ دونوں امور ان اجتہادی احکام کو' جو مخصوص حالات کے لیے وضع کیے گئے تھے' بدلے ہوئے حالات میں ناقابلِ عمل بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے شریعت کے مقاصدِ اولیہ فوت ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ ان اجتہادی احکام کو تبدیل کر کے انہیں ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے' تاکہ شریعت

کے اصل مقاصد پورے ہو سکیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر بادبانی کشتی کو کسی خاص سمت میں لے جانا ہو تو اس کے بادبان کا رخ اسی خاص سمت پر اس طرح رکھا جائے گا کہ کشتی مطلوبہ سمت میں حرکت کر سکے۔ لیکن جب ہوا کا رخ بدل جائے' تو بادبان کے رخ کو بھی اسی طرف بدلنا پڑے گا' تاکہ کشتی مطلوبہ سمت سفر کرتی رہے۔ ورنہ یا تو کشتی کا رخ منزلِ مقصود کی طرف سے پھر جائے گا' یا کشتی ایک ہی جگہ کھڑی ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصود کشتی کو ایک مقامِ مطلوب تک پہنچانا ہے' نہ کہ بادبان کا کسی خاص رخ پر رکھنا۔

علامہ ابنِ عابدینؒ نے اپنی کتاب "نشر العرف" میں لکھا ہے کہ "بہت سے احکام زمانے کے اختلاف کے باعث بدل جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تبدیلی "عرف" کے بدل جانے کے سبب سے ہوتی ہے' بعض میں کسی نئی ضرورت کے پیش آجانے کے سبب سے ہوتی ہے' اور بعض میں تبدیلی کا سبب زمانے کا فساد ہوتا ہے۔ مذکورہ اسباب کی وجہ سے احکام میں تبدیلی اس لیے ہوتی ہے کہ اگر احکام کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو بڑی مشقت اور نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور یہ چیز شریعت کے اصول "تیسیر و تخفیف" اور "دفعِ ضرر و فساد" کے خلاف ہوگی۔

اسی لیے فقہاء نے بہت سے مواقع پر اپنے مذہب کے امام کی تصریحات سے اختلاف کیا ہے' کیونکہ امام کی رائے ان معاملات میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تھی' اور خود امام کے مقرر کردہ اصولِ فقہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر امام اس بدلے ہوئے زمانہ میں ہوتے تو ان کا فتویٰ بھی وہی ہوتا جو موجودہ دور کے فقہاء کا ہے۔"

امام شہاب القرافیؒ نے بھی اپنی کتاب "الفروق" میں فرق ۲۸ کے تحت لکھا ہے کہ "منقولات پر ہر حال میں جمے رہنا دینی گمراہی کی ایک قسم ہے اور یہ علماء اور سلف صالحین کے پیشِ نظر مقاصد سے ناواقفیت اور جہالت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔"

علامہ ابن القیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں "زمان و مکان' احوال و عادات اور نیات میں تبدیلی کے باعث فتویٰ میں تبدیلی" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "فتویٰ میں تبدیلی کا یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کی حقیقت کو نہیں جانتے وہ شریعت کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں' جن کی وجہ سے لوگوں کو ناقابلِ برداشت تنگی' مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت' جس نے مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے' اس قسم کی تنگی کو پسند

نہیں کر سکتی' کیونکہ شریعت کی بنیاد حکمت اور عوام الناس کے دینی اور دنیوی مصالح پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ شریعت تو مجسم عدل و انصاف' یکسر رحم و ہمدردی' اور سراسر مصلحت و حکمت ہے۔ اس لیے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا' رحم کے بجائے سختی و نامہربانی کا' اور مصلحت و حکمت کے بجائے مفاسد و لغویات کا سبب بن جائے وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا خواہ تاویل کر کے اسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے۔"

(ترجمان القرآن جلد ۴۳ عدد ۱)

---

(۱) ابوالسعود کا پورا نام محمد ابن محمد العمادی ہے۔ ترکی کے ایک گاؤں اسکلیب کے باشندے ہیں۔ اسی لیے مفتیِ روم (ترکی) کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ۹۸۲ھ میں وفات پائی۔ سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کے زمانے میں فقہاءِ حنفیہ کے سرگروہ تھے۔ عثمانی سلطنت کے مفتیِ عام ہونے کے علاوہ قسطنطنیہ اور بروسہ کے قاضی تھے۔ پوری زندگی بڑی عظمت کے ساتھ گزاری۔ بعض مسائل میں اجتہاد بھی کیا ہے۔ ان کی بعض آرا کو ان کے زمانے نیز بعد کے علماء نے قبول کیا ہے۔ عربی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ آپ کی تفسیرِ قرآن بھی مشہور ہے۔

(۲) "مصالح مرسلہ" ایک فقہی اصطلاح ہے جس کے تحت تشریع اور قانون سازی کا وہ حصہ آتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفاد و مصلحت کا لحاظ رکھ کر سرانجام دیا جاتا ہے۔

رسائل و مسائل

زنانہ مریضوں کی تیمار داری

میں یہاں زیورچ (سوئٹزر لینڈ) میں ایک ہسپتال میں اسسٹنٹ میل نرس کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ یہاں کا معاشرہ ایک مخلوط معاشرہ ہے۔ اس لیے مجھے مردانہ اور زنانہ دونوں طرح کے مریضوں کی تیمارداری کرنی پڑتی ہے۔ مریض زیادہ تر عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ مجھے بوقت ضرورت ان کو نہلانا پڑتا ہے' بغیر کسی قسم کے پردہ کے۔ خصوصاً خواتین کے معاملہ میں کوئی حجاب روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ مریض اپنی عمر کے آخری حصہ میں ہی ادھر لائے جاتے ہیں اور ان کی اموات ادھر ہی واقع ہوتی ہیں۔ یہ لوگ انتہائی کمزوری اور لاغرپن کی حالت میں اس ہسپتال لائے جاتے ہیں۔ پردہ اور حجاب کی پابندیاں نہ ہونے پر آیا ایک مرد' زنانہ مریضوں کی تیمارداری کرسکتا ہے۔ اسلامی نکتہ نظر سے کیا یہ ملازمت جائز ہے یا نہیں ؟

آپ نے جس صورت کے بارے میں جیسے حالات میں استفسار کیا ہے اس کے مطابق آپ کو وقتی طور پر متبادل حلال ذریعہ معاش ملنے تک اس ملازمت کو جاری رکھنے کی شرعاً اجازت ہے۔ آپ کوشش کریں کہ جلد از جلد کوئی دوسری ملازمت آپ کو مل جائے جس میں آپ کو ناجائز اور معیوب کام نہ کرنے پڑتے ہوں۔

اگر اس ملک میں ایسا ممکن نہ ہو تو کوشش کریں کہ کسی دوسرے غیر اسلامی ملک میں' جہاں حلال ذریعہ روزگار میسر آئے' چلے جائیں اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو کسی اسلامی ملک میں واپس آجائیں۔ (عبد المالک)

بیٹیوں کا باپ کے ہمراہ حج

ایک دوست نے سوال کیا ہے کہ اس کی بچیاں' جو کہ ان کے ساتھ یہاں سعودی عرب میں رہائش پذیر ہیں' بالغ ہوچکی ہیں۔ اگر وہ اب اپنے والدین کے ساتھ حج کا فریضہ ادا کرلیں تو کیا ان کا فرض

عنداللہ ادا ہو جائے گا۔ یہ بات اس لیے بھی پوچھی جارہی ہے کہ اس وقت ان کے لیے حج ادا کرنا آسان ہے بہ نسبت بعد کے' جبکہ وہ خود کفیل ہو جائیں یا شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔

نابالغ بچے اور بچیاں حج کریں تو وہ نفل شمار ہوگا۔ بالغ ہونے کے بعد والدین کے ساتھ حج کریں تو فرض شمار ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں آپ آسانی کے ساتھ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ جو بچے اور بچیاں والدین کے ساتھ حج کرتے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔ اگر بالغ ہونے کے بعد حج کریں گے تو ان کا فرض ادا ہو جائے گا۔ دوبارہ حج کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ (عبدالمالک)

مصارفِ زکوٰۃ

ایک اسلامی مزدور تنظیم نے اس سال ۱۷ سے ۱۹ اپریل تک ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار رکھا تھا۔ اس کا موضوع تھا "مزدور تحریک کا اسلامی ماڈل" اس سیمینار میں ۴/۵ اسلامی ممالک کے ان افراد نے شرکت کی تھی جو اپنے اپنے ممالک میں مزدور فیلڈ میں کام کررہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اسلام کے حوالے سے کام کررہے ہیں۔ مقصد اس سیمینار کا یہ تھا کہ بین الاقوامی سطح پر امریکی' روسی اور چینی نظریات کی حامل مزدور تنظیموں کے مقابلے پر (جنھوں نے مسلمان ممالک کی مزدور تنظیموں کو بھی اپنا شکار بنایا ہوا ہے) اسلام کی علمبردار تنظیم قائم کرلی جائے۔ الحمد للہ کہ اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوا اور نہایت حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔ اس سیمینار میں ایک ایسے رفیق نے بھی شرکت کی جو خود اپنے کرایہ آمدورفت کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ کیا ہم زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کا کرایہ دے سکتے ہیں؟ آپ کا فتویٰ درکار ہے۔

سورۃ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک مصرف "فی سبیل اللہ" ہے۔ فی سبیل اللہ سے مراد اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کے تمام مراحل ہیں۔ غلبۂ دین کے لیے کام کرنے والوں کے جملہ مصارف زکوٰۃ سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔ ان مصارف میں سفر خرچ بھی شامل ہے۔ مشہور عالم' مفسرِ قرآن مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ اس کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے لیکن حق یہ ہے اور آئمہ سلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ

ہے یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظامِ کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں، ان کو سفر خرچ کے لیے، سواری کے لیے، آلات و اسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جاسکتی ہے۔ خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔

آئمہ اربعہ کا مسلک

فقہاءِ مالکیہ : ان الزکوٰۃ یعطی منہا المجاہد والمرابط وما یلزمہما من آلۃ الجہاد بان یشتری منہا سلاح او خیل لینازل علیہا و یاخذ من الزکوۃ ولو کان غنیا۔ (شرح الدردیر علی متن الخلیل بحوالہ فقہ الزکوۃ ج ۲ ص ۶۳۸)

"یعنی مجاہد کو زکوٰۃ اس کی جملہ ضروریات کے لیے دی جائے گی اگرچہ وہ غنی ہو، جن میں اسلحہ اور سواریاں سب شامل ہیں۔"

فقہاءِ شافعیہ : للامام الخیار ان شاء دفع الفرس الی الغازی تملیکا وان شاء استاجرلہ مرکوبا وان شاء اشتری خیلا من ہذا السہم و وقفہا فی سبیل اللہ فیعیرہم ایاہا وقت الحاجۃ فاذا انقضت استرد" (الروضۃ للنووی ج ۲ ص ۳۲۶ ـ ۳۲۷)

"امام کو اختیار ہے کہ زکوٰۃ کے مال سے مجاہدین کو گھوڑے خرید کر انہیں مالکانہ طور پر دے دے، چاہے زکوٰۃ کی رقم سے کرایہ پر لے کر دے دے، چاہے زکوٰۃ کی رقم سے سواریاں خرید کر بیت المال میں وقف کردے کہ بوقت ضرورت مجاہدین کو دیا کرے اور ضرورت باقی نہ رہنے پر واپس لے لیا کرے۔"

شوافع بھی فقیر اور غنی دونوں کے لیے جہادی ضروریات کو زکوٰۃ کی مد سے پورا کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

حنابلہ : ومذہب الحنابلۃ کمذہب الشافعیہ۔

"حنبلی فقہاء کا مسلک شوافع کی طرح ہے۔"

احناف : وحیلۃ التکفین بہا التصدق علی فقیرثم ہو یکفن فیکون الثواب لہما (درمختار، ج ۲ ص ۱۳)

البتہ احناف کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں زکوٰۃ کی رقم فقیر کو یہ کہہ کر دے دی جائے کہ وہ اپنی طرف سے مجاہد کو دے دے۔ اس سے صاحبِ مال اور فقیر دونوں کو ثواب ملے گا اور زکوٰۃ

ادا ہو جائے گی۔ حنفی مذہب کے مطابق آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ اپنی اسلامی مزدور تنظیم کے غریب کارکن کو زکوٰۃ کی رقم دے دیں کہ وہ اپنی طرف سے کرایہ کے لیے فلاں صاحب کو دے دے۔ خلاصہ یہ کہ تمام فقہاء کے نزدیک دینی خدمت سرانجام دینے والے کارکن کا کرایہ زکوٰۃ کی رقم سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ واللہ اعلم۔ (عبدالمالک)

ادھار قیمت میں اضافہ

ٹریکٹر کمپنی، کسانوں کو نقد خرید پر ایک ٹریکٹر تقریباً دو لاکھ بیس ہزار (۲۲۰۰۰۰) روپے میں دیتی ہے۔ جو کسان اتنی رقم ادا نہ کرسکیں ان کے لیے حکومت پاکستان نے یہ سہولت دی ہے کہ حکومت کمپنی کو دو لاکھ بیس ہزار روپے ادا کرکے ٹریکٹر خرید لیتی ہے اور کسان کی زمین رہن رکھ کر اسے یہ ٹریکٹر ادھار پر تقریباً تین لاکھ بیس ہزار روپے (۳۲۰۰۰۰) میں فروخت کرتی ہے اور یہ رقم آٹھ سال کی مدت میں قسطوں میں وصول کی جاتی ہے۔

کیا یہ "سود" ہے؟ کیا گورنمنٹ کے لیے یہ جائز ہے؟ اور کیا کسان اس سہولت سے استفادہ کرسکتے ہیں؟

اگر حکومت آٹھ سال کی مدت میں ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں رقم میں اضافہ نہ کرے اور جو زمین رہن رکھی ہے اس میں کاشت کرکے فصل کے ذریعہ کمائی بھی نہ کرے تو ایسا کرنا سود تو نہیں ہوگا۔ لیکن ۲ لاکھ بیس ہزار روپے کی جگہ ایک لاکھ مزید لیکر بہت گراں کرکے بیچنا بھی زیادتی ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ زمینداروں سے تھوڑا سا منافع حاصل کرے۔ تاہم اگر کوئی کسان، اس صورت میں جس طرح لکھا گیا ہے، ٹریکٹر خرید لیتا ہے تو اس کی یہ خریداری سودی نہ ہوگی اور یہ لین دین سودی نہیں ہوگا۔ (عبدالمالک)

زکوٰۃ اور تاوان کی ادائیگی

کیا فریقین میں مصالحت کرانے کے لیے جو تاوان اٹھایا گیا ہو، اس کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے کی جاسکتی ہے؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

آپ کے استفسار کا جواب یہ ہے کہ فریقین میں مصالحت کے لیے جو لوگ اپنے ذمہ تاوان کی ادائیگی لے لیں وہ مستحقِ اعانت ہوتے ہیں اور وہ زکوٰۃ کی رقم وصول کرسکتے ہیں۔ یہ مسئلہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ قرآن میں جو مصارفِ زکوٰۃ بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک

بقیہ بر صفحہ ۳۵

مطبوعات

نفاذِ شریعت ایکٹ ۱۹۹۱ کا علمی جائزہ : از قلم گوہر بار جناب مولانا گوہر رحمٰن صاحب

۔ ناشر: الجامعۃ الاسلامیہ' تفہیم القرآن' مردان۔ سفید اچھے کاغذ کے ۱۱۶ صفحات' ٹائٹل دبیز و رنگین' قیمت ۲۰ روپے۔

ابتداء" نفاذِ شریعت کی ایک مسلمان ملک میں اہمیت کا ذکر ہے۔ پھر اس سلسلے کی مساعی کا اور آخر میں نواز شریف صاحب کے دور میں پاس شدہ (اپریل ۱۹۹۱) نفاذِ شریعت ایکٹ کا۔ مولینا گوہر رحمٰن نے اس پر عالمانہ تنقید کی ہے۔ مولینا کا حافظہ ایک ایسا زبردست رجسٹرار ہے کہ ان گنت کتابوں کے حوالے فائیلوں میں تیار رکھتا ہے' اور مولینا جونہی کسی صحابی' محدث' مفسر' فقیہہ کی رائے کے ضرورت مند ہوتے ہیں تو ان کا رجسٹرار فوراً وہ حوالہ ان کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ اس علمی میدان میں وہ اپنے وقت کے بادشاہ ہیں۔

ان کی اس علمی کتاب میں جو نکات اٹھائے گئے ہیں' اور ایکٹ کے جن غلط یا کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے' وہ ہم جیسوں کے لیے علم افزا ہے۔ مجھے اس معاملے میں مولینا اور تمام علما کا بڑا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر عرض کرنا ہے۔

سیکولرازم اور اسلام کی جو جنگ بپا ہے' اس میں علما کا کبھی متحد ہو کر اور جذباتی کیفیت سے سرشار ہو کر یہ چاہنا کہ سارا کچھ ایک دفعہ جھولی میں آ جائے' اس میں ناکامی کا نتیجہ بڑا یاس انگیز ہوتا ہے۔ تدریج جو ٹال مٹول کے لیے ہوتی ہے وہ تو حکومتیں اختیار کرتی ہی ہیں' مگر علما کے لیے تدریج دوسری وجہ سے ضروری ہے۔ آج یکے بعد دیگرے کی ترتیب سے اپنے قدم پہلے معین کریں۔ مولینا مودودیؒ کی تحریک نے سارا زور پہلے اس ایک قدم پر صرف کردیا کہ قرار دادِ مقاصد پاس کی جائے۔ بعدازاں دستور میں ترامیم کے وقت علما کو ساتھ لے کر بہت بڑا کام کیا۔ دستوری خاکہ منگایا گیا تو اعلیٰ درجہ کے علما کو جمع کر کے ۲۲ متفقہ اصول طے کر کے حکومت اور قوم کے

سامنے رکھ دیے۔ اسی طرح آگے کے کاموں کو سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر جگہ جہاں نفاذِ شریعت کا مسئلہ آیا وہاں پہلے فوجداری قانون اور سزاؤں کو نافذ کیا گیا۔ حالانکہ مثبت کام کرنے کے بہت سے دروازے کھلے ہیں۔

علاوہ ازیں ضرورت اس بات کی ہے کہ علما محض لفظ شریعت کا وسیع تصور بیان نہ کریں بلکہ عوام میں جا کر اس کے کسی جزو یا پروگرام کی اخروی کے ساتھ دنیوی اہمیت واضح کریں۔ جلسہ ہائے عام میں رکھیں اور جا بجا مضامین لکھیں، مذاکرات کریں اور باقاعدہ عام آدمی کو ساتھ ملائیں جو یہ جانتا ہو کہ کیا لینا ہے اور کیا ملنے والا ہے۔ محض علما کا اپنے مخصوص شعور کی بنا پر آپس میں کبھی خدا چاہے تو اتحاد کر لینا یا پارٹی پالیٹکس کی ضروریات کے تحت کسی جگہ قوتِ حاکمہ یا ایوان کی بھاری تعداد پر اثر ڈال لینا یہ بالکل الگ چیز ہے۔

مثلاً تنخواہوں اور مزدوریوں کے سسٹم پر ایک بحث آپ عوام کے سامنے رکھیں۔ اور بتائیں کہ کتنے تھوڑے سے لوگ تمہارے خزانہ سے کتنا زیادہ مال لیتے ہیں، اور کتنے بے شمار ملازمین نہایت تھوڑے معاوضے پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس مسئلے پر لوگوں کو آپ اسلامی نقطہ نظر کا قائل کرائیں اور ایسی تبدیلی کرائیں۔ یعنی محسوس کیا جائے کہ علما کے پیچھے صرف آمین کہنے والے نہیں بلکہ بیدار شعور رکھنے والے عوام کی قوت جمع ہے۔ اس سے جو اثر قوت حاکمہ، ایوان مقننہ، دائرۂ سیاست، نیز پریس اور نوجوانوں اور محنت کاروں اور ملازمین پر اسلام کے حق میں پڑ سکتا ہے وہ سزاؤں کے نفاذ سے نہیں پڑ سکتا۔ مثبت پہلوؤں سے کام ہو تو لوگ سزائیں بھی سہتے ہیں۔ جو ماں اپنے ہاتھ سے روٹی، مکھن، دودھ اور پھل دیتی ہے۔ وہ کبھی چپت مکہ بھی مار لے تو بچہ سہ جائے گا۔ لیکن خالی چپت مکے کو وہ کیا کرے؟

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ ہمارے ملک میں دین سے انحراف، اور دین کو عقلی طور پر بودا اور ماضی کی حد تک قابلِ نفاذ ماننے والوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھی ہے جس کے دل میں علمائے دین کا احترام باقی نہیں۔ ان طبقوں کو بالعموم توسیعِ افکار و دلائل کے ذریعے جب تک کسی چیز کے خلاف یا کسی چیز کے حق میں تیار نہ کیا جائے، معاملات میں چاروں طرف سے رخنہ اندازی اور خردہ گیری ہوتی رہے گی۔ یہ طبقے پریس میں کالجوں کے اساتذہ اور ڈگری کلاسوں کے طلبہ میں ہیں، وکلا میں ہیں، سرکاری افسروں اور ملازمین میں بہت ہیں، عام بنکوں اور تجارتی کمپنیوں میں بہت ہیں، کیا آپ حضرات یا آپ کے نوجوانوں کے ایسے گروپ جو وسیع جدید مطالعہ اور زوردار اسالیبِ بیان سے واقف ہوں، کبھی فرداً فرداً یا وفود بنا کر ان حلقوں میں کام کرتے ہیں۔ کسی چیز کو

قانون کی شکل میں منوانے کے لیے کیا پہلے ان حلقوں میں سال دو سال کام کرنے کا تجربہ ہے۔

یعنی مذہب کو محض اس کے تقدس کی بنا پر مانا جائے' یہ تو وہ مقام ہے جو قلیل التعداد حضرات کو حاصل ہے۔ دوسروں کو مذہب کے ضروری ہونے پر' اس کے زندگی کے لیے مفید ہونے پر' اس کے طرز کو مہلک یا مضر ہونے پر دلائل کی طاقت استعمال کیے بغیر اور دوسروں کو مطمئن کرائے بغیر آپ مذہب کے تقدس کا احساس بھی ان میں پیدا نہیں کر سکتے۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ کام کا راستہ تھوڑا سا بدل کر یہ اختیار کرنا چاہیے کہ پہلے معاشرے میں کسی چیز کے لیے شعوری ایمان اور urge پیدا کرنے کی پوری کوشش کی جائے۔ محض اوپر اوپر جوڑ توڑ اور دباؤ کے ذریعے کام کرانا کم مفید ہے۔

افسوس کہ یہ کام بہت کم ہوتا ہے۔

مثلاً سود کا معاملہ ہے۔ آپ نے دس قرآنی آیات اور چوبیس مشہور احادیث کی روشنی میں اپنی کتاب میں پیش کیا۔

ایک شخص اس کا قائل ہو جاتا ہے کہ سود حرام ہے۔ اب وہ آپ سے سوال کرتا ہے کہ جو ادارے اس وقت سود پر چل رہے ہیں' وہ کیا کریں اور فوری متبادل کیا ہے کہ ایک بس خراب ہو گئی تو دوسری بس آگے کھڑی ہو گئی۔ موجودہ کسی بھی بنک کا مسئلہ عملاً یہ ہے کہ لاکھوں روپے' کروڑوں روپے اس نے مختلف پارٹیز کے لے رکھے ہیں۔ اس روپے کو اس نے آگے دس کمپنیوں میں پھیلا دیا ہوا ہے' ان کمپنیوں نے بڑی رقوم مشینری یا خام مال منگوانے میں خرچ کر دی ہیں یا آگے اپنے ذیلی کارندوں (مثلاً سیمنٹ ایجنسیوں) کو مال ادھار دے رکھا ہے۔ ایک ٹوٹنے یا ختم ہونے والے بنک کو اوّل تو اس کے متعلقہ کاروباری پھیلی ہوئی رقمیں جمع کر کے فوراً دے ہی نہیں سکتے' اور دے بھی سکیں تو بند ہونے والے کے کاروبار کا مال تو دریابرد بہت ہوتا ہے اور یہ مال بنک ہی کا نہیں' یہ تو پبلک کا ہے۔

آپ بنکنگ کی اس اسکیم پر بنکرز اور کاروباری طاقتوں کو پہلے مطمئن اور تیار تو کیجیے۔ ان کے پاس جائیے۔ ان کے مذاکرے منعقد کرائیے' خود بڑے بڑے سیمیناروں کا انتظام کیجیے' یہاں تک کہ سودی اسکیم کی طرح "دواور دو چار" کے انداز میں غیر سودی بنک کا فارمولا ہر شخص کو حفظ ہو جائے اور اسے تسلی ہو کہ رقم یہاں ڈوبنے کی نہیں اور کوئی کاروبار رکنے کا نہیں۔

آخر میں مولینا گوہر رحمٰن سے درخواست کروں گا کہ میں نے یہ گفتگو آپ کی ذات کے متعلق نہیں کی' آپ کا بھاری احترام ملحوظ رکھتے ہوئے "نفاذِ شریعت" کے قضیے کے بارے میں

اپنے دل کے اضطرابات کو دوسروں کی نمائندگی کے لیے عرض کیا ہے۔ ورنہ میرے نزدیک سود حرام ہے' حرمت کی سب سے شدید قسم ہے' اسی لیے میں تو اس مسلک کا ہوں کہ بیع المرابحہ کو بھی صحیح تسلیم نہیں کرتا کیونکہ حضورؐ نے تاکید فرمائی کہ اگر کسی معاملت میں سود کا اشتباہ بھی ہو یا شائبہ بھی ہو تو اس سے بچو' کیونکہ یہ سب سے سخت حرمت ہے۔ (ن۔ص)

IQBAL THE POET : از قلم جناب ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب' شعبہ انگریزی' پٹنہ یونیورسٹی۔ ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی آنریری سیکرٹری بزم اقبال' ۲ کلب روڈ' لاہور۔ سفید کاغذ' خوشنما انگریزی ٹائپ' مضبوط جلد۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

مجھے اقبال کی پرکشش نے نوازی نے اتنا سرمست رکھا کہ کبھی "تنقید بازی" (بازی بازی' باریش بابا ہم بازی) کی ضرورت' یا جرات نہیں ہوئی بلکہ اقبال کے فکر و فن کی سرشاری میں میری توجہ صرف ان حملوں کی طرف گئی جو اقبال پر نظریاتی محاذوں کے تحت کیے جاتے رہے۔ اس حال میں ڈاکٹر عبدالمغنی پہلی شخصیت ہیں جن کے سامنے آنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ سے زیادہ وسیع مطالعہ علمی اور جائزہ ادبیات مشرق و مغرب کے ساتھ عظیم مگر مظلوم اقبال کے لیے کوئی اور بھی معرکہ آراء ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو میں تو اقبال پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ان کی طویل نظموں کی تشریح سے مجھے نئی نئی معنویتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ورنہ میں تو بدوقسم کا قلم کار ہوں۔

اس وقت ڈاکٹر صاحب کی مختصر انگریزی کتاب میرے سامنے ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی دوسرے تمام اصحاب یا کتب یا فنونِ تحریر کے بارے میں نہایت متوازن ناقد ہیں اور کسی کمزوری کو نہیں بخشتے' لیکن اقبال کی محفل میں آکر بالکل میری طرح وہ حقائقِ اقبال اور شعرِ اقبال کے طالب علم بن جاتے ہیں۔ ابتدائیہ میں ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ سے اقبال شناسی میں ان کا مقام سمجھیے' لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی نے دنیا کی کسی زبان میں اقبال سے بہتر شاعر پیدا نہیں کیا۔ وہ دنیا کے عظیم ترین شعراء کی صف میں مقام رکھتے ہیں۔ اقبال کی دلپذیر شاعری میں تخیل اور ہنر کا ایسا امتزاج ہے جو ان کے قارئین کے دلوں کی گہرائیوں میں سے جوش ابھارتا ہے' نیز وہ ان کے ذہنوں کو منور کردیتا ہے۔ خیال و جمال کی دولتِ معنی کا یہ معیار تاحال مغربی نصف کرۂ ارض میں مکمل اور بلا واسطہ دستیاب نہیں ہے۔ (آزاد ترجمہ)

ان الفاظ کے علاوہ مقامات و احوال کے عنوان کے تحت اور بھی زیادہ پرزور عبارات لکھی ہیں۔

ان جملوں کو آپ کتاب میں تفصیل سے پڑھیں تو ماننا پڑے گا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں توضیحی تنقید کی ہے جو انکشافاتِ معانی اور وضاحت مقاصد سخن کا ذریعہ ہے۔ یہ بھی ایک اہم نوعیت کی تنقید ہے کہ وہ نابغہ زیبائی ہو' صاحبِ شاہ نامہ فردوسی ہو' مثنوی مولائے روم ہو' شکسپیئر کے ڈرامائی ادب پارے اور شعرپارے ہوں اس سے بالاتر ہوتے ہیں کہ آپ ان کی غلطیاں پکڑیں۔ ایسے لوگوں کا مقام یہ ہوتا ہے کہ ان کے نہایت پیچیدہ اور تہ در تہ جہان معنی کے ایک ایک جزو کو سمجھا جائے اور آشکارا کیا جائے۔ خود میرا تجربہ ہے کہ بعض اشعار اور بعض اصطلاحات کو میں کئی برس بعد جا کے سمجھا' اور اب بھی پوری طرح بھروسہ نہیں ہے کہ میں جہانِ اقبال کے ہر کوہ وکاہ کا رمز شناس ہوں۔ ایسے گراں مایہ اربابِ فکر و فن کے لیے صرف توضیحی تنقید مفید ہوتی ہے جو طالب علمانہ انداز میں ہو۔ ورنہ اگر بانگِ دہل قسم کی تنقید میں لکھی جائیں گی تو پھر وہ Gone with the Wind ہو کے رہیں گی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے پہلے ہی مضمون میں جنگِ عظیم اول سے ۶ سال پہلے کے امپیریلسٹ اقدامات' مشرقی تہذیب کی تباہی اور عالمی فضا میں پائے جانے والے بحران کو محسوس کرکے وہ غزل لکھ چکے تھے جس کا مصرعۂ اول یہ ہے کہ ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

اور جس میں مغربی عقل پرستی اور مادی تہذیب کے لیے خاص طور پر یہ انتہائی شعر کہا گیا ہے کہ

تمہاری تہذیب' اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ' ناپائیدار ہو گا

اسی میں پیش گوئی کی کہ جبریت ختم ہوجائے گی' مادی کمزوری اور قوت کا اہم اثر نہیں رہے گا۔ مختلف مغالطہ ہائے نگاہ غائب ہوجائیں گے۔ حقائق اور چھا جائیں گے۔ انصاف کی قوت چھا جائے گی۔ افادہ پرستی کا زور ٹوٹ جائے گا۔ بالکل بنیادی صداقتیں غالب ہوجائیں گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ آزادی اور فلاح کی طرف رخ مڑ جائے گا۔ میں اس ایک مقام کا اختصاراً ذکر کرکے' اصل ابوابِ کتاب کو قاری کے لیے چھوڑتا ہوں کہ وہ خود پڑھے۔

آئندہ ابواب یہ ہیں۔ "آفاقی زاویہ نظر" "اثرونفوذ" "پیغام اور ذریعۂ پیغام رسانی" مراد

محض زبان نہیں بلکہ صنفِ بیان ہے۔ "خاص خاص شاہکار نگارشات" "لطیف و باریک جمالیات" (مختصر نظمیں اور قطعات وغیرہ) "غزلوں اور رباعیوں (چو بیتیوں) پر ایک نظر۔"

ان سب میں سے اہم، جامع اور تفصیلی باب خاص خاص نگارشات کا ہے۔ اس باب میں علامہ مرحوم کی طویل اور اہم نظموں کو لیا گیا ہے۔ خاص طور پر متعدد طویل نظموں کا واقعاتی توضیحات کے لحاظ سے الگ تجزیہ ہے اور فنی محاسن اور معانی کی وسعتوں اور خاص خاص اشاروں کے لحاظ سے الگ گفتگو ہے۔ ان نظموں کے نام "شمع و شاعر" "شکوہ و جواب شکوہ" "خضرِ راہ" "طلوعِ اسلام" "مسجدِ قرطبہ" "ساقی نامہ" "فرشتے آدم کو بہشت سے رخصت کرتے ہیں اور روحِ ارضی استقبال کرتی ہے" "تسخیرِ فطرت" "محاورہ مابین خداوند و انسان" "جوئے آب" "حدی" (نغمہ ساربانِ حجاز)۔

یوں تو حکیم الامت کی شاعری کا ہر حصہ اپنے اندر مخصوص نوادر رکھتا ہے، محض تکراران کا طریق نہیں ہے۔ بعض متذکرہ نظموں کے متعلق بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے مدرسہ فکر کی حکمت کی ہر ضروری بات ان میں آگئی ہے اور ہم اقبال کے سوزوساز اور اس کے مکمل پیغام اور مقاصد کا بآسانی شعور حاصل کرسکتے ہیں۔ بیشتران نظموں کا اصل سانچہ غزل کا ہے، یعنی ہر نظم مختلف مربوط غزلوں کا مجموعہ ہے۔ پھران میں ماضی کی یادیں، حال کے کرب اور مستقبل کی امیدیں سموئی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کے ہر طبقے کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے ان میں خصوصی خطاب پائے جاتے ہیں۔ اور ان نظموں کی تخلیق کے زمانوں کے فرق کے باوجود ان کے لیے اقبال کا مردِ مومن، اقبال کی خودی اور اقبال کا شاہین جگہ جگہ محسوس ہوتا ہے۔ میرا خیال ناقص یہ ہے کہ اگر ان نظموں کو پوری طرح سمجھ کے پڑھ لیا جائے تو قاری اقبال کے جہان سوزوساز، جہان تخلیق اور جہان آرزو کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

یہ ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کا بڑا احسان ہے کہ انھی نظموں کی پردہ کشائی اردو میں بھی کی ہے اور انھی کو اب انھوں نے انگریزی خواں طبقے کے لیے بھی "خم زندگی کشادم" کا سماں پیدا کردیا ہے۔

(ن - ص)

بقیہ بر صفحہ ۳۴

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں

تفہیم القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: -/۱۷۵ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۴۰۱۴- ۲۳۶۶۶۵ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳